درد کی حد سے پَرے
جتیندر بلّو

دردکی حد سے پرے

(افسانوں کا مجموعہ)

جتیندر بلّو

قلم پبلی کیشنز، ممبئی

نام کتاب : درد کی حد سے پرے
مصنف : جتیندر بلّو
طبع اول : جنوری ۲۰۱۰ء
قیمت : ۲۰۰ روپے بیرون ملک دس برطانوی پونڈ
سرورق : پکاسو کی ایک پینٹنگ
ناشر : الیاس شوقی

مصنف کا پتہ
6 Corfton Lodge, Corfton Road , EALING ,
LONDON W5 2HU. U.K.
Tel: 020 8998 0185 Mobile: 07787842541

تقسیم کار : ☆ قلم پبلی کیشنز :
۱۷/۱۷، ایل، آئی، جی، کالونی، کرلا (مغربی) ممبئی ۷۰
☆ کتاب دار ۱۰۸/۱۱۰، جلال منزل ٹیمکر اسٹریٹ، ممبئی ۴۰۰۰۰۸
☆ سیفی بک ایجنسی امین بلڈنگ، ابراہیم رحمۃ اللہ روڈ، نزد جے جے ہسپتال جنکشن، ممبئی ۳
☆ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ : ممبئی، دہلی، علی گڑھ

(ادبی پرنٹنگ پریس، شیفر ڈ روڈ ممبئی میں طبع ہوئی)

انتساب

شعور کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا کہ میرا یقین ہندو دیو مالا کے دیوتا برہما، وشنو اور مہیش کی تکون کے متعلق پختہ ہو گیا۔ اس لیے کہ برہما تخلیق کار ہے۔ وشنو اُس کی ہر تخلیق کو برقرار اور محفوظ رکھتا ہے۔ لیکن مہیش (شیو) اُس تخلیق کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے کہ آئندہ اُسے بہتر اور حسین پیرائے میں پیش کیا جائے۔ یہ تمام فطری رنگ ہر فن کار کی شخصیت میں تادمِ آخر موجود رہتے ہیں۔ خوش قسمتی سے میرے ادبی سفر کے دوران دوستوں کا ایک تکون بھی شامل رہا ہے۔ اُن کی صحبت، ذوق اور مشورے میرے لیے کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔

مَیں اپنی یہ کتاب "درد کی حد سے پرے"
اپنے پیغمبری دَور کے دوست ندا فاضلی اور بھلے وقتوں کے دوست انور قمر اور الیاس شوقی کے نام معنون کرتا ہوں۔

جتیندر بلّو

فہرست

سُریندر پرکاش سے ایک مختصر مکالمہ

اچانک میری آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرہ اندھیرے سے بھرا تھا۔ مگر اس کے وسط میں روشنی کا ایک مختصر سا ہالہ دائرے کی صورت میں پھیلا ہوا تھا جہاں کوئی ذی روح شخص اپنے چہرے پر ملکوتی مسکراہٹ لیے بیٹھا تھا۔ اُس کے چوڑے ماتھے پر ذہانت ہی ذہانت تھی۔ آنکھوں پر چورس چشمہ اور سر پر سجے سنورے سالم بال تھے۔ اُس کے ریشمی لاچے اور ململ کے کُرتے سے اُس کو پہچاننے میں مجھے ذرا بھی دشواری نہ ہوئی کہ وہ اردو افسانے کی آبرو، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی روشن ضمانت سریندر پرکاش ہی ہے۔ منٹو، بیدی اور کرشن کے بعد اگر اردو کے کسی کہانی کار کو مَیں نے جی جان سے پسند کیا ہے تو وہ ''بجوکا، رونے کی آواز، بازگوئی، بچپن میں سنی ہوئی ایک کہانی، بالکونی اور پوسٹر جیسی عالمی معیار کی کہانیوں کا خالق سریندر پرکاش ہے۔ روشنی کا ہالہ اُس کے گرد قائم تھا اور وہ اپنی مخصوص ملکوتی مسکراہٹ لیے ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھے جارہا تھا۔ مَیں خواب اور حقیقت کے درمیان اُلجھا ہوا تھا کہ مَیں کس کیفیت سے گزر رہا ہوں اور سچ کیا ہے؟ مگر میرے لب مارے اشتیاق کے اپنے آپ وا ہو گئے: ''کب آئے؟''

''میں گیا ہی کہاں تھا؟ جو لوٹ کر آتا... میں تو ہمیشہ گھر والوں، تم جیسے دوستوں اور اردو ادب کے ساتھ تھا۔''

پُراسراریت اُس کے فن کا خاصا رہی تھی۔ وہ اُس کا مضبوط ہتھیار بھی تھا جس کی بدولت وہ اپنی ہر کہانی میں ایسی تخلیقی فضا قائم کر دیا کرتا تھا کہ قاری اُس میں گم ہو کر رہ جائے۔ اُس نے مجھ سے پوچھا:

''کہانیوں کا مجموعہ ترتیب دے رہے ہو؟''

''ارادہ تو ہے۔ مگر تم کو کیوں کر علم ہوا؟ میں تو سات سمندر پار رہتا ہوں؟''

بغور اُسے دیکھنے پر پتہ چلا کہ میرا آنے والا مجموعہ ''درد کی حد سے پرے'' کی فائیل اُس کے آگے میز پر رکھی ہے۔

''تمھاری کہانیاں اس قدر دلچسپ ہوا کرتی ہیں کہ زمین و مکان کے تمام فاصلے چٹکیوں میں طے ہو جاتے ہیں۔ کبھی انڈیا، کبھی لندن اور تمھارا چھوڑا ہوا شہر بمبئی میری پہنچ سے کبھی باہر نہیں رہا۔ اردو کا قاری جانتا ہے کہ تم اپنی بات کہنے کا اپنا ہی انداز رکھتے ہو۔''

''تم ایک عرصے تک میرے فن اور میری شخصیت کا جائزہ لیتے رہے ہو۔ یہ تمھارا بڑا پن ہے۔ تم ایک ذہین ناقد کی تیز نظر بھی رکھتے ہو۔''

اُس نے میری بات سنی اَن سنی کر کے فائیل اُٹھالی۔

اس مجموعے میں ایک یا دو کہانیاں ایسی بھی ہیں جن کو تم نے دوبارہ لکھا ہے۔ وہ مجھے بدلی بدلی سی محسوس ہوئیں۔''

بستر کو چھوڑ کر میں اُس کے قریب آن بیٹھا۔ روشنی کا ہالہ بدستور اُس کے گرد قائم تھا۔

''میں خوش ہوں کہ تم نے میری تمام کہانیاں پھر سے پڑھ ڈالی ہیں۔ 'بند دروازے' اور 'دھماکا' کو دوبارہ لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اُن میں پہلے ایک آنچ کی کسر کہیں رہ گئی تھی۔ لیکن اُن کے موضوعات بڑے انوکھے تھے۔ بلکہ اچھوتے تھے۔ اکثر مجھے ہانٹ بھی کیا کرتے تھے۔ خود کو دوبارہ لکھوانے پر اس قدر بضد کہ میں اُن کو از سرِ نو لکھنے پر مجبور ہو گیا۔''

''یعنی پرانی شراب کو تم نے نئی بوتل میں بند کر دیا ہے۔؟''

''ہاں۔ شراب جتنی پرانی ہوگی، اتنی ہی وہ جان دار، نشہ آور اور دیرپا ثابت ہوگی۔''

''مگر تمھاری کہانیوں میں میں نے اکثر مغربی اور مشرقی تہذیبوں کا تصادم شدت سے پایا ہے۔ کوئی خاص وجہ تو ضرور رہی ہوگی؟''

''ہاں۔ پینتیس برس پہلے جب میں نے اجنبی دھرتی پر قدم رکھا تھا تو اپنی مشرقی اقدار، روایات، تیج تہوار، گنگا جمنی تہذیب اور اپنا دھرم کرم میرے ساتھ تھا۔ اُن سب کا مغربی کلچر، تہذیبی نظام اور وہاں کی اقدار سے ٹکرانا فطری امر تھا۔ اسی کارن تہذیبی ٹکراؤ میری کہانیوں میں شدت سے در آیا ہے۔''

''یہ ایک منجھے ہوئے فن کار کی ٹھوس دلیل ہے.... تمھاری کہانیوں میں، کہیں مغرب نے مشرق کو جھٹلایا ہے تو کہیں وہ اس کے نزدیک آیا ہے۔ پھر کہیں دونوں نے ایک دوسرے کی ضروریات کو سمجھ کر گلے بھی لگایا ہے۔''

''تم نے ٹھیک جانا اور صحیح تجزیہ کیا۔ غیروں کی دھرتی پر رہ کر تارکینِ وطن کو کالونیل کمپلیکس اور سفید چمڑی کے احساسِ برتری سے نجات پانے کا موقع بھی نصیب ہوا ہے۔ ورنہ فرنگی کبھی ہمارے مائی باپ رہے تھے اور ہم اُن کے دست بستہ غلام۔''

''یہ تو تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔ مگر اب دونوں فریق آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرتے ہیں۔ وجہ سیدھی سی ہے۔ ہمارے ملک آزاد ہو چکے ہیں۔ ہندوستانی عوام خودمختار ہے اور ہماری معیشت بھی توانا ہو چکی ہے۔''

''تم الگ الگ تہذیبوں کا علم رکھتے ہو۔ اُن کے معاشرے بھی تم سے ڈھکے چھپے نہیں رہے۔ انھیں قریب سے جاننا تمھارا شوق بھی رہا ہے اور ذوق بھی۔''

اُس نے فائیل اُٹھا کر، کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر ایک کہانی پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔

''تمھاری کہانی 'چکرویو' اپنی جگہ کمال کا درجہ رکھتی ہے۔ اُس کا مرکزی کردار راکیش (راکی) اپنا ہی حسن رکھتا ہے اور اپنی ہی سوچ۔ وہ بھی مہابھارت کا ویرابھمنیو بنا کلچر کے چکرویو میں داخل

ہو جاتا ہے۔ مگر وہاں سے باہر نکلنے کا راستہ اُسے سجھائی نہیں دیتا۔''

''ہاں۔ یہ اُس کا المیہ ہے۔ مگر اُس کی محبوبہ/ بیوی اُسے کسی بھی طور اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی...''

''بل... لُو۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ ورنہ عام طور پر بیویاں اپنے عشق، اپنے عاشق اور ذاتی سرگرمیوں پر پردہ ڈالا کرتی ہیں۔ مگر کیتھرین کسی ڈھنگ کا بھی احساس جُرم پالنا پسند نہیں کرتی۔ وہ حد درجہ فرینک ہے۔ کھلی کتاب ہے۔ وہ زندگی میں جنسی آزادی کا جو تصور رکھتی ہے وہ مشرقی اخلاقیات سے میل نہیں کھاتا۔ وجہ سیدھی سی ہے۔ تہذیبیں الگ الگ خمیر سے جو اُٹھی ہیں۔''

''یہی تو اس کہانی کی بنیاد ہے۔ اسی پر تو پوری عمارت کھڑی ہے۔''

''بالکل۔ بالکل۔ تم نے اپنی کہانیوں میں جہاں جہاں جزئیات کا استعمال کیا ہے، وہ کہانی کے موضوع اور اُس کے کرداروں کے منفی/مثبت رویوں سے جڑی ہوئی اُسے آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوئی ہے۔ کرافٹ، فن اور ہیئت پر تو تمھاری پکڑ پہلے سے ہی مضبوط تھی۔ اب تمھارے اسلوب اور زبان میں بھی بلا کی پختگی اور سلاست چلی آئی ہے۔''

''پیارے سریندر۔ سچ تو یہ ہے کہ زبان لکھنا مَیں نے تم سے ہی سیکھا ہے۔ لیکن بے حد کوشش کے باوجود مَیں تم جیسی زبان لکھنے کا اہل نہیں ہو پایا۔ یقین جانو تمھاری کوئی بھی تحریر پڑھتے وقت موسیقیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب، جملوں کی ساخت، مکالموں کی بندش اور اُن کی گہری معنویت کانوں میں سازوں کی طرح بج اُٹھتے ہیں۔''

اُس کے چہرے کی مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ اُس پل وہ مجھے آسمانوں سے اُترا ہوا کوئی فرشتہ لگا جو دھرتی کے بندوں سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور ہر حال میں اُن کی خیریت کا طلب گار رہتا ہے۔

''تمھاری کہانیوں میں فکری عنصر تو موجود رہتا ہی ہے۔ بعض کے موضوعات بھی چشم وا ہوتے ہیں۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ بیرونِ ملک میں آباد اردو کے ادیبوں کی رسائی وہاں تک ہوئی ہے جہاں تک تمھاری نظر نے سفر کیا ہے۔ وہاں کے بیشتر ادیب صرف واقعات لکھنے میں یقین رکھتے ہیں۔

لیکن تم داخلیت اور خارجیت کی آمیزش اور اُس کے فن سے خوب خوب واقف ہو۔ تم شروع سے ہی تجزیاتی اور تجرباتی ذہن کے مالک رہے ہو۔ ضروری نہیں کہ وہاں کے دیگر ادیب بھی ویسا ہی ذہن اور سوچ رکھتے ہوں۔''

یہ کہہ کر اُس نے فائیل اُٹھالی۔ صفحے اُلٹتا پلٹتا رہا۔ پھر فائیل کو اپنی جگہ پر رکھ کر گہری سوچ میں غلطاں ہو گیا۔ وہاں سے آزاد ہوا تو بولا:

''تمھاری کئی کہانیوں میں تجربہ بہت اُبھر کر آیا ہے۔ ادب میں یہ ناگزیر بھی سمجھا گیا ہے۔ اُس کی اہمیت بھی خاص ہے۔ تجربہ + مشاہدہ + موضوع + تخیل + فن + اسلوب + زبان۔ ان سے جو پلازمہ (PLASMA) تیار ہوتا ہے وہ ناقابلِ فراموش ادب کی داغ بیل ڈالتا ہوا عہد بہ عہد رائج رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہی کہانی عظیم تسلیم کی گئی ہے جو کبھی بوجھل نہ ہو کر انسانی جبلتوں کی عکاسی کرے۔ اُس میں ماضی، حال اور مجموعی زندگی کے گہرے عکس ہوں۔''

مَیں خوش تھا کہ اُس نے میرا تجرباتی ذہن جان کر اُس کی قدر کی تھی۔ مَیں خوشی خوشی بول اُٹھا:

'' تجربے کو مَیں اپنی زندگی میں پہلی اہمیت دیتا ہوں۔ مَیں نے سدا اُس کا دامن تھامے رکھا ہے۔ کارن یہ کہ اُس میں تبدیلی کے آثار چھپے ہوتے ہیں۔ وہ بذاتِ خود زندگی کو بدلنے کی قوت بھی رکھتا ہے۔ ازل سے وہ انسان کی ذہنی بیداری پر کائنات کو بدلتا رہا۔ اُس کا وہ عمل آج بھی جاری وساری ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر وہ موت کو کبھی تسخیر نہیں کر پائے گا۔''

اُس کے لبوں سے یہ جملہ فضا میں اُبھرنا تھا کہ کمرہ اندھیرے سے بھرتا چلا گیا۔ ہالے کی روشنی بھی مدھم پڑنے لگی۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میرے اطراف اندھیرے کی مکمل حکمرانی تھی۔ لیکن فائیل پر لکھے ہوئے الفاظ ''درد کی حد سے پرے'' روشن تھے۔

جتیندر بلّو

۲۲ر اکتوبر ۲۰۰۹ء

لندن

درد کی حد سے پَرے

جہاں مَیں رہتا ہوں اُس سڑک کے موڑ پر ''جارج اینڈ ڈریگن'' نام کا ایک کشادہ سا پب (PUB) واقع ہے، جو گذشتہ سو برسوں سے زائد وہاں کھڑا ہر راہ گیر کو اپنی تاریخی اہمیت کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ صدی کے سفر کے دوران زمانے بدلے، معاشرے بدلے، مالکان بدلے، پینے پلانے والے بدلے، لیکن پب کا اندرونی ماحول اور بیرونی ساخت جوں کی توں قائم رہی۔ وہ گزرے زمانوں کی تہذیب، ثقافت اور طرزِ زندگی کا نمونہ بنا رہا۔ آنکھ بھاتا وکٹورین آبنوسی فرنیچر، شکار کھیلتے گھڑسوار رؤسا اور اُمرا کی تصویریں، جن میں اُن کے شکاری کتے (باؤنڈ ڈاگز) لومڑی (فاکس) کے تعاقب میں دوڑتے نظر آتے ہیں۔ ایک سنہری فریم کی تصویر میں کنگ جارج پنجم اور کوئین میری کے روبرو ۱۹۱۱ء کے دلّی دربار میں ہندوستانی نوابین اور راجے مہاراجے سر جھکائے کھڑے تھے۔ چھت سے لٹکتے ٹیوڈر عہد کے رنگ دار لیمپ اور کونے کھدروں میں مصری، ہندوستانی اور افریقی نوادرات کے اعلیٰ نمونے سجے تھے۔ پب کی ہر دیوار نے سلطنتِ برطانیہ کا عروج و زوال بھی دیکھ رکھا تھا۔ لیکن پب میں ہیجان زدہ موسیقی پیدا کرنے

کا کوئی سامان موجود نہ تھا اور نہ ہی وہاں جوان نسل کے چھوٹے بڑے گروپ دکھائی دیتے۔ ورنہ وہ اس قدر شور مچاتے ہیں کہ پب کی دیواریں بھی لرز اٹھیں، اور عمر رسیدہ لوگ کانوں پر ہاتھ دھرے کہیں اور جانے کی سوچیں۔ لیکن ''جارج اینڈ ڈریگن'' پب کا سلسلہ ہی الگ تھا۔ شام ڈھلتے ہی بوڑھے، بوڑھیاں اور ڈھلتی عمر کے لوگ اکثریت میں جمع ہو جاتے۔ کبھی کبھار ایسے بزرگ بھی دیکھنے میں آجاتے جن کی ٹانگیں قبر میں لٹکی ہوتیں اور وہ ویل چیئر (WHEEL CHAIR) پر بیٹھے بیئر کی ہلکی ہلکی چسکیاں بھرتے دبے دبے لہجے میں گفتگو کیا کرتے۔ میں نے بارہا اُس پب کے متعلق جوان طبقے کو کہتے سنا تھا کہ وہاں جا کر آدمی ایک ہی شام میں بوڑھا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ بلکہ قبرستان میں اپنی قبر کے واسطے زمین تلاش کرتا پھرتا ہے۔

میں اُن دنوں تازہ تازہ مانچسٹر سے لندن میں وارد ہوا تھا۔ یک و تنہا۔ میرے آگے پیچھے وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ کام سے فارغ ہو کر اکثر سوچتا اب کہاں جاؤں؟ کہاں نہ جاؤں؟ کیا کروں اور کیا نہ کروں؟ شیطان کی آنت کی طرح پھیلے ہوئے شہر میں چند ہفتے گزار کر مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ بے گانگی، لاتعلقی، اکیلا پن اور تنہائی دولت مند معاشرے کی دین ہیں، جو رفتہ رفتہ ہر ذی ہوش کو لاعلاج امراض کی طرف دھکیلا کرتی ہیں اور وہ جلد یا بدیر اُن کا شکار بھی ہو کر رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ فیکٹری سے نکلنے پر آکاش کا رنگ بھی مجھے بدلا بدلا سا لگتا۔ شام کو رات میں تبدیل کرنا سنگین مسئلہ بن جاتا۔ ایسے میں کئی بار میرے پانو اپنے بیڈ سٹر میں داخل ہونے سے پہلے ''جارج اینڈ ڈریگن'' سے ہو کر گزرا کرتے۔ میں پہلی بار وہاں گیا تھا تو چاروں طرف بوڑھے، ضعیف اور قریب المرگ مرد اور عورتوں کو دیکھ کر بڑی الجھن ہوئی تھی۔ جی چاہا کہ اُلٹے پانو لوٹ جاؤں اور ادھر کا رُخ دوبارہ ہرگز نہ کروں، مگر اُن بوڑھی آنکھوں میں ہمدردی تھی، پیار تھا، اَن کہی کہانیاں تھیں۔ رویّوں میں خلوص تھا۔ گردو پیش نگاہ دوڑانے پر پتہ چلا کہ میں سفید فام مخلوق کے درمیان واحد رنگ دار شخص نہیں ہوں، بلکہ وہاں کوئی دوسرا شخص بھی موجود ہے جو ایک کونے میں اکیلا بیٹھا بیئر سے دل بہلا رہا ہے۔ اُس سے آنکھیں چار ہوئیں تو وہ سراپا پھول

بن گیا۔ لیکن میں نے منہ پھیر لیا اور کاؤنٹر سے چھوٹی بیئر خرید کر، اُسے مکمل نظر انداز کیے، کچھ فاصلے پر اخبار کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ شخص تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کھانستا رہا۔ لگا کہ وہ دانستہ کھانس کے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا۔ آدھی دُنیا قانونی اور غیر قانونی طور پر دیکھ کر انگلینڈ پہنچا تھا۔ میری نظریں اخبار پر ہی جمی رہیں۔ لیکن دل میں کھدبد برابر جاری رہی کہ وہ شخص مسلسل مجھے گھورے جا رہا ہے اور وہ میری صحبت کا خواہش مند بھی ہے۔ میں نے نظریں بچا کر اُسے دیکھا تو وہ خود میں کھویا ہوا سگریٹ کے کش بے فکری سے لے رہا تھا اور دھواں چھت کی طرف چھوڑ رہا تھا۔ وہ ستر بہتر برس کا دبلا پتلا معمر شخص تھا۔ گہرا گندمی مائل رنگ اپنی طرف کھینچتا ہوا۔ پچکے ہوئے گال اور بڑی بڑی آنکھیں، مگر اندر کو دھنسی ہوئیں۔ سالم سفید بال اور چہرے پر وقت کی جھریاں، جو اپنی ناآسودگی کی داستان بیان کر رہی تھیں۔ اُس کا مکمل جائزہ لے کر گمان گزرا کہ ہو نہ ہو وہ ضرور انڈیا سے تعلق رکھتا ہے اور ذات کا گجراتی ہے۔

اُس رات بستر پر دراز ہو کر جب مَیں نے آنکھیں بند کیں تو وہ بزرگ شخص اچانک کہیں سے نمودار ہو کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ میرے ضمیر نے لعنت ملامت کی کہ میں نے اُس بزرگ کی قدر کیوں نہیں کی؟ جب کہ اُس کی مسکراہٹ میں خلوص تھا، دعوت تھی، اپنا پن تھا۔ پردیس میں اکثر اپنے لوگ اپنوں کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں، جیسے اُن کا اپنے بھائی بندوں سے کبھی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ پھر مجھ میں اور اُن لوگوں میں فرق ہی کیا ہوا؟ خیال آیا کہ اُس نے ضرور سوچا ہو گا کہ مَیں کس قدر مغرور شخص ہوں اور مجھے اپنی جوانی پر کتنا ناز ہے کہ مَیں کسی بوڑھے شخص کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتا۔ یہی سوچتے سوچتے مَیں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

اگلی شام مَیں پب میں اِسی ارادے کے ساتھ داخل ہوا کہ اگر وہ بزرگ وہاں موجود ہوا تو مَیں ڈرنک خرید کر چپکے سے اُس کے قریب جا کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ لیکن چاروں طرف نگاہ دوڑانے پر بھی جب وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تو خیال آیا کہ چلو گلو خلاصی ہوئی۔ ضمیر بھی صاف ہو گیا۔ نہ کوئی بوجھ نہ کوئی بندش۔ مگر ڈرنک خرید کر جب مَیں کاؤنٹر سے پلٹا تو مَیں نے اُس معمر شخص کو کل والی میز پر ہی بیئر پیتے اور سگریٹ پھونکتے ہوئے پایا۔ اُس نے مجھے اپنی میز کی طرف

بڑھتے ہوئے دیکھا تو اُس کا چہرہ کل کی نسبت زیادہ روشن ہو گیا۔ کرسی کے ہتھوں کا سہارا لے کر وہ کھڑا ہو گیا اور سامنے کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بیٹھنے کی دعوت دی۔ تعارف ہونے پر میرا اندازہ اور مشاہدہ صحیح نکلا کہ وہ ذات کا گجراتی اور پٹیل برادری سے تعلق رکھتا ہے۔ پتہ چلا کہ اُس کی پیدائش ملک یوگینڈا کے شہر کمپالا کی ہے۔ دو سو برس پہلے جب نو آبادیاتی انگریز اُس کے آباواجداد کو ریل کی لائنیں بچھانے افریقہ لے گئے تھے تو اُس کے پُرکھوں کو باقاعدہ روزی روٹی نصیب ہونے لگی تھی۔ پھر وہ لوگ وہیں کے ہو کر رہ گئے اور آہستہ آہستہ اُس زمین کا حصہ بن گئے، لیکن انھوں نے اپنی سنسکرتی، دھرم کرم، تیج تہوار، بھاشا اور پرم پراؤں کو برقرار رکھا کہ اُن کے بنا جیون گزارنا اُن کے لیے ممکن نہ تھا۔

''افریقہ بہت یاد آتا ہے، مگر چھوڑنا پڑا۔''

وجہ میں جانتا تھا۔ لیکن رمن بھائی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔

''یوگینڈا کو انگریزوں سے آزادی ملی تو ملٹن اوبیٹے (OBOTE) پرائم منسٹر بنا۔ بعد میں وہ پریذیڈنٹ ہو گیا .... آدمی سیانا تھا۔ اُس کا ہم لوگوں کے ساتھ سلوک ٹھیک ٹھاک تھا۔ جانتا تھا اکانامی (معیشت) پر ایشیائی لوگ چھائے ہیں۔ مگر وہ تو دیش اور اپنے لوگوں کی بھلائی چاہتا تھا۔ ۔۔۔بس''

''پھر؟''

''آگے کیا بتاؤں .... اُس کے بعد ایڈی امین نے Coup کیا اور پریذیڈنٹ بن گیا۔'' پھر وہ قدرے رُک کر بولا:

''سالا پاگل تھا۔ سمجھا پوری دُنیا اُس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔''

ہم دونوں ایک ہی وقت پر ہنس دیے۔ لیکن میں جلد ہی اُس سے الگ ہو کر ایڈی امین کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ تو پیدائشی مینیک (MANIAC) تھا۔ زرخیز ملک کو اُس نے تباہ کر ڈالا اور آخر میں سعودی عرب میں پناہ لے کر گمنامی کی موت مرا۔

''آپ کو یہاں آئے تو عرصہ ہو گیا ہو گا؟''

''ہاں ں ں۔''

اُس کی ہاں خاصی لمبی تھی۔ پھر وہ کچھ سوچتا ہوا چھت کو دیکھ کر بولا:

''پریذیڈنٹ امین نے ہم لوگوں کو بہت تنگ کیا۔۔۔ پوچھو مت۔۔۔۔ تین مہینے کا وقت دے کر ملک چھوڑنے کا حکم جاری کر دیا۔۔۔۔ ہم ایشیائی بہت پریشان ہوئے۔''

''اور آپ کو اپنے پریوار کے ساتھ یہاں آنا پڑا؟''

''ہاں ں ں۔۔۔۔ اس کے بنا کوئی چارہ نہ تھا۔۔۔۔ پہلے سوچا اپنے باپ دادا کے دیش بھارت کو چلے جائیں، لیکن انڈیا کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ ادھر جا کر ہم تنگ ہوتے۔۔۔۔ اسی کارن ہم انگلینڈ چلے آئے۔ اپنے زیادہ لوگوں کے پاس برٹش پاسپورٹ تھا۔''

ہم دیر تک خاموش رہے، اس کا سگریٹ ختم ہو چکا تھا۔ پیکٹ کھول کر اُس نے مجھے سگریٹ پیش کیا، لیکن مَیں نے انکار کرتے ہوئے اُسے بتایا کہ لگاتار کھانسنے کے کارن ڈاکٹروں نے مجھے سگریٹ نوشی سے منع کر دیا ہے۔ یہ سنتا تھا کہ وہ اور سنجیدہ ہو گیا۔ انتہائی اپنائیت اور پیار سے مجھ کو دیکھتا رہا آخرش چھت کو دیکھ کر بولا:

''کیا بتاؤں۔۔۔ اِدھر جب ہم لوگ آئے تو میرے بچے چھوٹے تھے۔۔۔۔ پر ایک بات ضرور بولوں گا۔۔۔۔ میری پتنی بہت ہمت والی عورت تھی۔ وہ نہ ہوتی تو ہم سب برباد ہو جاتے۔۔۔۔ مَیں پروفیشنل اکاؤنٹنٹ تھا۔ پر میرے کو شروع میں ادھر فیکٹری میں کام کرنا پڑا۔''

مَیں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ مَیں بھی آپ کی طرح تعلیم یافتہ، ڈگری یافتہ ہوں، لیکن ان دنوں فیکٹری میں دن رات کام کر رہا ہوں کہ میری بھی آپ کی طرح چند مجبوریاں ہیں جن کے سبب مجھ کو اپنے جیون کی راہ بدلنی پڑی۔ لیکن مَیں نے اُسے اپنی کوئی مجبوری بیان نہ کی اور خاموش رہا۔

''پر جلد مجھ کو اِدھر ایک بڑی کمپنی میں نوکری مل گئی۔۔۔۔ کیا بتاؤں، کمانے والا ایک، کھانے والے پانچ۔۔۔۔ پر ہم میاں بیوی نے اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر بچوں کو پرائیویٹ اسکول میں لکھایا پڑھایا۔۔۔۔ اب وہ سب اچھی پوزیشن میں ہیں اور باہر ملکوں میں رہتے ہیں۔''

''رمن بھائی۔ یہ آپ نے وہی کیا جسے ماں باپ اپنا فرض سمجھ کر کیا کرتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کی

بہتری کی خاطر خود کو بھی قربان کر ڈالتے ہیں۔''
لیکن وہ اپنی تعریف سن کر ذرا بھی خوش نہ ہوا۔ بلکہ اس کے چہرے کی جھریاں مزید گہری ہو گئیں۔ خیال آیا کہ وہ اپنے بچوں کو بہت مس کر رہا ہے، جو ہزاروں میل دور قیام پذیر ہیں۔ مَیں نے یہ بھی محسوس کیا کہ بیئر کے گلاس کی طرف اُس کی توجہ کم ہے، جبکہ سگریٹ کو وہ زیادہ ہی ترجیح دے رہا ہے۔ مَیں اُس کے متعلق قیاس آرائی کر ہی رہا تھا کہ وہ پوچھ بیٹھا:
''تمھارے گھر والے سب یہاں ہیں ناں ں ں؟''
یہ سننا تھا کہ میرا ذہن برق رفتاری سے اپنے دیس میں جا پہنچا۔ ماں باپ، بہن بھائی، رشتہ دار اور دوست یار آنکھوں کے سامنے اُبھر کر مجھے اُداس کر بیٹھے۔ مَیں سرد آہ بھر کر رہ گیا۔
''نہیں رمن بھائی۔ میرا یہاں کوئی نہیں... میرے سب اپنے پرائے سات سمندر پار رہتے ہیں۔''
''اور تمھاری دھرم پتنی؟''
مجھے ہنسی آ گئی۔ میرا ہنسنا فطری تھا۔ لہٰذا اس کی وضاحت کرنی بھی ضروری تھی۔
''ابھی میرے پانو میں بیڑی نہیں پڑی۔ مگر ایک ڈیڑھ برس میں ضرور پڑ جائے گی۔ جب گھر لوٹوں گا۔''
ہم دونوں ہنس دیے۔ گلاس اُٹھا کر اُس نے ہلکے ہلکے گھونٹ بھرے۔ لیکن مَیں اپنی ہونے والی بیوی کے تصور میں کھو گیا، جو شروع میں میری پریمیکا تھی۔ پھر منگیتر بنی اور اب وہ بمبئ کے مضافات میں رہائش پذیر میرا انتظار کر رہی ہے۔ اُس کے والدین ہماری شادی کے لیے رضا مند تو تھے، مگر اُس کے والد ماجد نے ایک کڑی شرط رکھی تھی کہ جب تک میرے پاس اپنا ذاتی فلیٹ نہیں ہوگا، شادی نہیں ہوگی۔ وہ اِس حق میں نہیں تھا کہ اُس کی بیٹی سسرال میں جا کر سارے کنبے کے واسطے روٹیاں سینکتی پھرے اور ساس کی کٹیلی باتیں بھی سنے۔ مَیں نے اُسے مشورۃً تجویز پیش کی تھی کہ مَیں بیاہ سے پہلے کرائے کی جگہ لے لوں گا۔ مگر اُس نے میرا مشورہ یہ کہہ کر رد کر دیا کہ ذاتی فلیٹ میٹریل ایسٹ (MATERIAL ASSET) ہوتا ہے اور نئے نویلے جوڑے کے واسطے مالی تحفظ بھی۔ لہٰذا مَیں نے دل پر پتھر رکھ کر اپنی منگیتر سے دو ڈھائی سال کی مہلت چاہی

تھی کہ پردیس جا کر دن رات محنت کر کے، اتنی رقم جمع کرلوں کہ واپسی پر ہمارا اپنا فلیٹ ہو۔ وہ رواں اشکوں سے مجھ کو دیکھ کر مان گئی تھی۔

اُس نے نیا سگریٹ سلگایا۔ مجھے خاصا تعجب ہوا کہ وہ اس عمر میں بھی بلا کا سگریٹ نوش تھا۔ ہلکا سا گھونٹ بھر کر بولا:

''بیاہ کے بعد لوٹو گے یا وہاں رُک جاؤ گے؟''

''یہ کہنا تو کافی مشکل ہے۔''

اُس نے کرسی آگے کھسکائی۔ میز پر کہنیاں ٹیک کر ٹکٹکی باندھے مجھے تکتا رہا۔ کچھ یوں کہ میں اُس کا کوئی اپنا ہوں، جو کبھی اس سے بچھڑ گیا تھا اور آج مدتوں بعد اُس سے ملا ہوں۔ مجھے سمجھاتے ہوئے بولا:

''یہ سرد ملک جہاں ہم رہتے ہیں، زیادہ اچھے نہیں ہیں.... یہاں رہ کر جیون دلدل بن جاتا ہے.... آدمی اُس میں دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ پھر کبھی نکل نہیں پاتا۔''

مَیں ہمہ تن گوش تھا۔ اُس نے اپنی سوچ کا ایک اور در کھولا:

''اپنے دیس میں آدمی روکھی سوکھی کھا کر بھی خوش رہتا ہے....تم ابھی جوان ہو۔ جب تک یہاں ہو خوب محنت کرو، خوب پیسا بناؤ، پھر اس طرف پلٹ کر بھی مت دیکھنا۔''

مَیں حیرت کا پُتلا بنا اُس کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ وہاں اپنائیت تھی۔ آنکھوں میں نرماہٹ تھی اور ہونٹوں پر صداقت۔ خیال آیا کہ میرا اِس شخص کے ساتھ رشتہ ہی کیا ہے؟ جو پہلی ہی ملاقات میں اپنی زندگی کا تجربہ مجھ پر نچھاور کر رہا ہے اور احساس دلائے جا رہا ہے کہ مَیں اُس کا کوئی قریبی عزیز ہوں۔

موسمِ سرمانے دبے پانو قدم رکھ دیے تھے۔ دن روز بروز چھوٹے ہونے لگے اور راتیں لمبی۔ سہ پہر کو اندھیرا سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔ مَیں فیکٹری کے احاطے کے باہر قدم رکھتا تو پوری دُنیا اندھیرے میں ڈوبی ہوتی۔ سردی کی شدت الگ سے پریشان کرتی۔ جس

روز میرا بدن زیادہ تھکا ہوتا یا مجھے اپنی منگیتر کی یاد زیادہ ستاتی تو میرے پانو پب سے ہو کر گزرا کرتے۔ اس دوران میں میری رمن بھائی سے کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ سرسری کم، بھرپور زیادہ۔ عمروں کا فرق مٹ چکا تھا۔ تعلقات میں قربت بڑھ گئی تھی اور ہم دانا دوستوں کی طرح پیش آیا کرتے۔ جس روز میں پب میں داخل ہوتا تو مجھے سفید فام بزرگوں کی بھیڑ اور اُن کی میزوں کے درمیان سے ہو کر رمن بھائی تک پہنچنا ہوتا۔ لیکن اُن کی کمزور اور دُنیا دیکھی آنکھوں میں نسلی امتیاز کا شائبہ نہ ہوتا۔ بلکہ وہ کھلی مسکراہٹ سے میرا خیر مقدم کرتے۔ رمن بھائی سب سے الگ تھلگ اپنے مخصوص کونے میں اکیلا بیٹھا دکھائی دیتا۔ نیم اندھیرے میں چھپا ہوا وہ کونہ، وہ میز، وہ کرسی یقیناً اُس کی زندگی کا اہم جز بن چکے تھے۔ میری جھلک پاتے ہی وہ پھول کی طرح کھل اُٹھتا۔ شریر کا لہو اُس کے چہرے پر دوڑ آتا اور آنکھیں ہرن کی طرح پھیل جاتیں۔ لیکن ہر بار اُسے اکیلا پا کر مجھے اچنبھا بھی سخت ہوتا کہ اُس علاقے میں پٹیل برادری کے بے شمار لوگ رہائش پذیر تھے۔ وہ سبھی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ اکثر اپنے ہی بھائی بندوں میں گھومتے پھرتے نظر آتے۔ مگر ایک رمن بھائی تھا جس کی صحبت میں مَیں نے کبھی کسی شخص کو نہ دیکھا تھا۔ نہ پب میں اور نہ پب سے باہر کوئی دوست، شناسا یا رشتہ دار۔ ایک شام موقع غنیمت پا کر مَیں نے اُس سے دریافت کر ہی لیا کہ آخر ماجرا کیا ہے؟ اکیلے رہنے کی وجہ کیا ہے؟ اُس کے چہرے کی جھریاں مزید گہری ہو گئیں۔ کچھ دیر تک وہ سگریٹ کو اپنی زرد مائل انگلیوں میں گھماتا رہا، گھماتا رہا۔ پھر دو تین کش لیے اور ہمیشہ کی طرح سنجیدہ ہو گیا۔ بولا:

''ان ملکوں میں بڑھاپا گرد کی طرح ہے.... لوگ باگ بوڑھے آدمی کو نکما سمجھ کر اُس سے پرے پرے رہتے ہیں.... اُس سے ملنا تو دور رہا، اُس سے بات کرنا بھی زیادہ پسند نہیں کرتے۔''

اُس کے جواب سے مَیں زیادہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔ میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ اُس کا دائمی مرض ہی اصل وجہ تھی، جس کے سبب برادری کے لوگ اُس سے دور دور رہا کرتے۔ اُسے دمے کا دیرپا مرض لاحق تھا اور وہ جان لیوا روگ اُسے گھن کی طرح چاٹ رہا تھا۔ اُسے اپنی بیماری کا احساس ضرور تھا لیکن وہ اُس کے متعلق فکر مند نہ تھا۔ ایک دفعہ اُس پر کھانسی کا اتنا شدید حملہ ہوا تھا کہ اُس کی

آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ سانس اُکھڑتے ہی چہرہ فق ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کی غیر حالت دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ میں نے اُٹھ کر اُسے سنبھالنا چاہا، لیکن اُس نے میرا ہاتھ جھٹک کر مجھے خود سے الگ کر دیا۔ پھر پینٹ کی جیبوں کو ٹٹولتا ہوا اُس میں سے پمپ نکال کر منہ میں اسپرے (SPRAY) کیا اور کرسیوں کو تھامتا ہوا ٹائلیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے سخت غصہ آیا کہ کس قماش کا آدمی ہے، جو مصیبت کے وقت بھی کسی کی مدد لینا پسند نہیں کرتا۔ میں نے اُس جیسا بٹیلا شخص زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کچھ دیر میں جب وہ ٹائلیٹ سے لوٹا تو بالکل بھلا چنگا تھا۔ چہرے مہرے سے ذرا بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ کچھ دیر پہلے اُس پر کھانسی اور دمے کا شدید حملہ ہوا تھا۔ میں نے چھوٹتے ہی کہا:

''رمن بھائی تم لگ کر اپنا علاج کیوں نہیں کرواتے؟ یہ بیماری تو تمھاری جان لے بیٹھے گی؟''

لیکن اُس پر کوئی ردِ عمل نہ ہوا۔ بلکہ وہ چپکے سے آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہاتھ بڑھا کر اُس نے میز سے سگریٹ کا پیکٹ اُٹھانا چاہا، لیکن میں نے اُس کا ہاتھ تھام کر پیکٹ کو ایک طرف سرکا دیا۔ اُسے میری حرکت ذرا بھی بُری نہ لگی۔ بلکہ دردمندی سے مجھ کو دیکھتا ہوا میری آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

''اب علاج کرانے کا کیا فائدہ؟ کیا بتاؤں .... ایک دن جانا بھی تو ہے۔ جتنی جلدی اُتنا اچھا۔ فیونرل (FUNERAL) کا پورا خرچہ بھر دیا ہے۔''

لیکن میرا غصہ اپنی جگہ قائم تھا۔ کسی طور بھی کم ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ میں مزید اُکھڑ گیا:

''میں جانتا ہوں، تمھاری دیکھ بھال کرنے والا یہاں کوئی نہیں؟ لیکن تم اپنے بیٹوں کے پاس امریکا تو جا سکتے ہو.... وہاں تمھاری بہو بیٹیاں ہیں۔ وہ لگ کر تمھاری خدمت کریں گی۔''

بیٹوں کا ذکر سن کر اُس کا چہرہ وہ نہیں رہا، جو عام حالت میں ہوا کرتا تھا۔ وہ بجھ سا گیا۔ عجب سا دُکھ، عجب سی اُداسی اُس کے وجود پر پھیل گئی۔ خیال آیا کہ وہ دُکھ، وہ اُداسی اُس کی زندگی کا چراغ بجھائے چلے جا رہے ہیں اور وہ بے یار و مددگار اِس امید پر جی رہا ہے کہ کب چراغ بجھے، دم نکلے اور اُس کی آتما کو شانتی ملے۔ رقت بھری آواز میں گویا ہوا:

''ان ملکوں کی ہوا بڑی خطرناک ہے.... آدمی کے تن من پر ٹرنت اثر کرتی ہے۔ پھر وہ صرف اپنی خاطر ہی زندہ رہتا ہے۔ اپنے بارے میں ہی سوچتا ہے اور کسی سے گہرا سمبندھ رکھنا پسند نہیں کرتا۔''

''تمھارا مطلب ہے کہ تمھارے بیٹے تمھارا خیال نہیں رکھیں گے؟ تمھارا علاج نہیں کروائیں گے؟''

''سنو ویکشن۔'' اُس نے کرسی آگے کو کھسکائی اور ٹوٹتی جڑتی آواز میں بولا:

''تم ابھی جوان ہو...... میری عمر کو پہنچو گے تو وہی محسوس کرو گے جو میں کرتا ہوں.... میرے لڑکے کنوارے تھے تو میرے دل کے ٹکڑے تھے۔ اُن کا بیاہ ہو گیا تو وہ مجھ سے ذرا دور ہو گئے.... پھر اُن کی اولاد ہوئی تو وہ کچھ اور دور ہو گئے اور جب اُن کی ماں کا پانچ برس پہلے دیہانت ہو گیا تو کافی دور ہو گئے.... اور اب تو اتنے دور ہو گئے ہیں کہ بس.... کیا بتاؤں؟''

''مگر رمن بھائی وہ تمھارے بیٹے ہیں تمھارا اپنا خون ہیں؟''

''ہاں ں ں..... وہ تو ٹھیک ہے، پر آخری سمے میں اُن کو پریشان کروں.... جا کر اُن پر بوجھ بنوں... یہ ٹھیک نہ ہوگا۔''

اُس کی آواز اُس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ مزید کچھ کہنے کو اُس کے ہونٹ کپکپا اُٹھے، مگر اُس کا دُکھ اُس کے وجود پر اتنا بھاری تھا کہ وہ آواز میں شامل نہ ہو سکا۔ وہ پتھر کی مورت بنا میرے سامنے بیٹھا تھا۔ گیلی آنکھوں سے رواں آنسو جھریوں میں اٹک رہے تھے۔ اُس روز صحیح معنوں میں مجھے اُس سے ہمدردی ہو گئی تھی اور وہ جو کہنا چاہتا تھا، براہِ راست مجھ تک پہنچ چکا تھا۔

رُت بدلی تو پھول مسکرا اُٹھے۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ موسم سہانا تھا اور فضا خوشگوار۔ لیکن پب کا وہ مخصوص کونہ ویران ہو چکا تھا۔ رمن بھائی کی صحت رو بہ زوال تھی۔ اُس کا آخری سفر دور نہ تھا۔ مَیں اُس کی مزاج پُرسی کرنے اُس کے فلیٹ پر بھی جایا کرتا تھا، جہاں وہ پچھلے پینتیس (۳۵) برسوں سے قیام پذیر تھا۔ وہیں اُس کے بیٹے جوان ہو کر ڈاکٹر اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنے تھے اور وہیں اُس کی بیوی کا دیہانت بھی ہوا تھا۔ اُس کی مرتیو پر اُس کی سنتان پہلا جہاز پکڑ کر لندن بروقت پہنچ گئی تھی۔ مگر انتم سنسکار کی تمام رسمیں جب پوری ہو چکیں تو وہ سبھی ایک ایک کر کے اپنے

گھروں کو لوٹ گئے۔ رمن بھائی کو اپنی اکلوتی بیٹی سے کوئی شکایت نہیں تھی کہ وہ پرایا دھن تھی۔ لیکن دونوں بیٹے روانگی سے پہلے سوچ بچار میں ڈوبے رہے کہ آیا ان حالات میں بوڑھے باپ کو اپنے ساتھ امریکا لے جائیں یا اُسے اپنے ہی رحم و کرم پر اکیلا چھوڑ جائیں؟ بڑا بیٹا جانتا تھا کہ وہ اپنی ماں باپ کا پہلوٹھی کا بچہ ہے۔ باپ کے آخری دنوں میں سیوا کرنا اور اُس کی دیکھ بھال کرنا اُس کا اولین فرض ہے، اور ایسا کرنے سے اُس کی ماں کی آتما کو شانتی بھی ملے گی۔ یہ سنسکار اُسے بچپن اور جوانی میں اپنے ماں باپ سے ملے تھے۔ لیکن وہ بذاتِ خود جدید زمانے کا جدید آدمی تھا۔ میڈیکل اُس کا پروفیشن تھا۔ آتما اور پنر جنم کو سرے سے مانتا نہیں تھا۔ اُس کا ٹھوس یقین تھا کہ آدمی کا بدن ایک مشین کی طرح ہے جس کے کل پُرزے جب جواب دے جاتے ہیں تو مشین کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔ لہٰذا وہ قدرت کی عطا کردہ واحد زندگی کو بلا کسی ذمہ داری کے آزادانہ طور پر جینا چاہتا تھا۔ اُسے ذاتی آزادی اور اپنی فیملی کی آزادی بہت عزیز تھی۔ البتہ چھوٹے بیٹے کے خیالات الگ تھے۔ وہ باپ کا احترام کرتا تھا اور جذباتی طور پر اُسے جڑا ہوا تھا۔ اُس نے باپ کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے اپنا ذہن بنا لیا تھا۔ لیکن جب اُس کی بیوی پر یہ حقیقت آشکار ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ اُس نے اپنے گھر والے پر دباؤ ڈال کر اور یہ کہہ کر اُس کا ذہن بدل ڈالا:

''کاکا کا روگ بہت جونا (پُرانا) ہے۔ سگریٹ کارن وہ کھانستا رہتا ہے۔ پھر سگریٹ تو اُس کا جیون ٹھہرا.....رات میں تیری میری اور بچوں کی نیند خراب کرے گا؟.....بڑھاپا کاٹنا آسان نہیں ہوتا۔ گھر والوں پر بوجھ بن جاتا ہے.....میری مانو تو کاکا کو کیئر ہوم (CARE HOME) میں بھرتی کرا دو.....خرچہ دونوں بھائی بروبر (برابر) دیتے رہنا۔''

اگلے روز دونوں بھائی سوگوار سر جھکائے، ہاتھ جوڑے باپ کی شرن میں تھے۔ رمن بھائی سفید کرتا، دھوتی پہنے، بڑھی ہوئی داڑھی، پریشان بال، گیلی آنکھیں اور اُن کے نیچے سیاہ حلقے لیے بیالیس برس کی ازدواجی زندگی کا سوگ منا رہا تھا اور بیوی کے ساتھ دُکھ سُکھ میں بیتا ہر واقعہ یاد کر رہا تھا۔ بڑے بیٹے نے رُک رُک کر کہنا شروع کیا:

''باپو! بھا (ماں) چلی گئی...آپ اکیلے رہ گئے ہو.....دیکھ بھال کرنا، کھانا بنانا، وقت کاٹنا اکیلے میں

مشکل ہوگا.....روگ بھی پُرانا ہے۔ آپ ٹھیک سمجھو تو.....کیئر ہوم میں بات کریں۔''
رمن بھائی نے گردن اُٹھا کے پہلے بڑے بیٹے کو دیکھا، پھر چھوٹے کو اور اپنی نظریں اُن پر جمادیں۔ چھوٹے نے بڑے کی بات کو آگے بڑھایا:
''باپو جی.....آپ ہم کو غلط مت سمجھو۔ کیئر ہوم میں برابر دیکھ ریکھ، کھانا پینا اور میڈیکل ہوتا ہے۔ اپنے کئی لوگ اب اُدھر رہتے ہیں.....دل بہل جائے گا.....سمے بھی بیت جائے گا۔ خرچے کی چنتا ذرا بھی نہ کریں۔''
یہ سننا تھا کہ رمن بھائی کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اُس نے سوچا اگلا منٹ آنے سے پہلے وہ اپنے بیٹوں کو گھر سے نکال دے، مگر وہ مجبور تھا کہ وہ اُس کے جگر پارے تھے، نورِ نظر تھے۔ قریب ہی سگریٹ کا پیکٹ دھرا تھا۔ اُس نے سگریٹ سلگا کر کش لیے اور بیٹوں کو تأسف سے دیکھتا رہا۔ پھر دُکھ کے ساتھ بولا:
''تم دونوں بھائی میری چنتا مت کرو.....مَیں اپنی دیکھ بھال کرلوں گا.....دو چار سال میں اور بوڑھا ہو جاؤں گا تو پھر دیکھوں گا، مجھ کو کیا کرنا ہے؟.....تب تم دونوں کو بتادوں گا۔''
بھائیوں نے ایک دوجے کو دیکھ کر سر جھکالیا۔ لیکن اُس روز رمن بھائی کو یقین ہو گیا تھا کہ اُس کے بیٹے اُس سے حد درجہ دور ہو گئے ہیں اور اب اُن پر اُس کا اختیار زیادہ نہیں رہا۔ بلکہ وہ ایک طرح سے انھیں کھو بیٹھا ہے۔

ہر دن گزرنے پر رمن بھائی کا شریر کمزور پڑ رہا تھا۔ میری شعوری کوشش رہا کرتی کہ مَیں اُسے ہسپتال میں داخل کرادوں، مگر وہ بضد تھا۔ اُس کا جواب ایک ہی ہوا کرتا:
''اب کس کے واسطے جیوں؟ اور کاہے کو جیوں؟''
اُس کے یہاں زندہ رہنے کی تڑپ یکسر ختم ہو چکی تھی اور وہ جلد از جلد دُنیا کو خیر باد کہنا چاہتا تھا۔ وہ اُس گیلی لکڑی کی طرح تھا، جو سُلگ سُلگ کر ختم ہو چکی ہو۔ تاہم دھواں برابر اُٹھ رہا ہو۔ اس دوران میں میری منگیتر کا خط قریب قریب روز ہی آیا کرتا تھا۔ مضمون ایک سا ہوا کرتا۔ ''کب

آ رہے ہو؟ کہاں تک پہنچے ہو؟ بس اب چلے آؤ۔ انتظار زیادہ نہیں ہوتا۔ اپنا خیال رکھنا۔''
میں فلیٹ بُک کر چکا تھا۔ چند آخری قسطیں ادا کرنی باقی تھیں۔ لہٰذا میں محنت اور زیادہ اوور ٹائم کر رہا تھا۔ منزل دور نہ تھی۔ میں بہ آسانی اُسے دیکھ سکتا تھا۔ کبھی کبھار چشم تصور سے یہ بھی دیکھ لیتا کہ میں دولھا بنا گھوڑی پر سوار بارات لیے سسرال کی طرف بڑھ رہا ہوں اور بینڈ باجے کا شور فضا میں گونج رہا ہے۔

ایک روز میں اپنے معمول کے مطابق پب میں اکیلا بیٹھا تھا۔ رمن بھائی سے ملے ہوئے چند روز بیت چکے تھے۔ مخصوص کونہ ویران تھا۔ میں ہی اُسے شاذ و نادر آباد کر دیا کرتا تھا۔ پب کے مستقل گاہک مجھ سے میرے بزرگ دوست کی خیر خیریت دریافت کرتے رہتے تھے۔ باہر شام ڈھل چکی تھی اور اُجالا ہلکی ہلکی تاریکی میں تحلیل ہو رہا تھا۔ اچانک پب کا دروازہ کھلا اور رمن بھائی چھڑی تھامے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتا، کرسیوں کو تھامتا ہوا میری طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ انتہائی لاغر ہو چکا تھا۔ بدن کا رہا سہا گوشت بھی مرض اور عمر کی نذر ہو چکا تھا۔ لگا کہ کوئی پنجر گور میں سے اُٹھ کر چلا آیا ہے۔ مَیں نے اُٹھ کر اُس کا سواگت کرتے ہوئے کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ لیکن اُس نے گردن کے اشارے سے ڈرنک کے لیے منع کر دیا۔ روبرو بیٹھ کر اُس نے رُک رُک کر کمزور آواز میں کہنا شروع کیا:

''کیا بتاؤں.... مَیں کل بھی آیا تھا.... پر تم نہ آئے۔ دیر تک انتظار کیا۔''

''آپ جانتے تو ہو مَیں روز روز یہاں نہیں آتا۔''

''ہاں ں ں.... پر آج امید تھی تم ضرور آؤ گے۔''

اُس کی غیر حالت دیکھ کر مَیں اندر باہر سے ہل چکا تھا۔ وجدان سا ہوا کہ مَیں آخری بار اُس کو دیکھ رہا ہوں۔ کسی روز بھی اُس کی زندگی کا سفر تمام ہو جائے گا۔ خیال آیا کہ وقت کے ساتھ آدمی کیا سے کیا بن جاتا ہے؟ پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ لیکن اس پر اُس کا اختیار بھی تو نہیں ہے؟ وہ کٹھ پتلی بنا حالات کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔ رمن بھائی نے جیکٹ کی جیب سے چند کاغذات نکالے اور چھانٹ کر ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔

''میرا ایک کام کرنا.... میرا اب کوئی بھروسا نہیں .... شریر اب ساتھ نہیں دے رہا۔ کسی پل بھی چلا جاؤں گا.... تم کو معلوم ہے میرا بڑا بیٹا نیویارک میں رہتا ہے اور چھوٹا نیو جرسی میں .... اُن دونوں کے نام اور فون نمبر میں نے اس کاغذ پر لکھ دیے ہیں۔ کسی ایک فون کر دینا.... اب میں ....''

اُس کی آواز بھر آئی تھی اور آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئی تھیں۔ مجھے سخت افسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی آخری خواہش بھی پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُس کی دلی تمنا تھی کہ وہ اپنے بیٹوں کو جی بھر کر دیکھ لے۔ اُنھیں گلے سے لگائے اور اُس کا انتم سنسکار اور کریا کرم بھی اُن ہی کے ہاتھوں سے ہو۔ کیونکہ اُس کا اندھ وشواس تھا کہ بیٹوں کا ایسا کرنے سے باپ کی آتما کو شانتی ملتی ہے اور اُسے سورگ کی سیڑھی بھی نصیب ہوتی ہے۔ میں عجب تذبذب میں تھا۔ آخرش کچھ سوچ کر گویا ہوا:

''کہو تو آج ہی تمھارے بیٹوں کو فون پر بتا دوں کہ تم بہت بیمار ہو اور تمھارے پاس وقت....''

''ناں ں ں .... میرے جیتے جی ایسا مت کرنا۔ میں اُن کے آگے جھک جاؤں میری آتما کو دُکھ ہوگا۔''

میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ اُس ضدی بالک کی طرح ہے جو اپنی آن بان شان کی خاطر کسی کے آگے جھکنا پسند نہیں کرتا کہ اُس کی انا دیوار بن کر اُس کے سامنے آن کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن وہ تو اُن لڑکوں کا باپ تھا۔ اُن کو دُنیا میں لے کر آیا تھا۔ کوشش کے باوجود میں اُس کا یہ رویہ سمجھ نہ پایا۔

''رمن بھائی تمھاری پہچان کے کئی لوگ یہاں رہتے ہیں اور کچھ نزدیکی رشتہ دار بھی .... یہ کاغذ تم کسی ایک کو دے دو؟''

اُس نے اپنا بے جان سا ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا۔ دیر تک لمبی لمبی سانس بھرتا رہا اور جب وہ بحال ہوگئی تو بولا:

''وہ سب لوگ دھن دولت بنانے میں مست ہیں.... اُن کے پاس سمے نہیں ہے.... تم کو اس دیس میں آئے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی.... تم کو ان ملکوں کی ہوا ابھی برابر نہیں لگی۔''

میں ایک بار پھر تذبذب کے بھنور میں تھا۔ عقل ساتھ نہیں دے رہی تھی، کیا قدم اُٹھاؤں؟ مگر اُس نے وہ کاغذ میرے ہاتھ پر رکھ کر میری مٹھی بند کر دی۔ پھر چھڑی کے سہارے مشکل سے اُٹھا۔

شفقت سے مجھے دیکھا۔ خلوص سے اپنا لرزاں ہاتھ میرے سر پر پھیرا اور صدق دل سے گویا ہوا:
''بھگوان تم کو سدا خوش رکھے۔ مَیں آخری پل تک تمھارے لیے دعا کروں گا۔''
وہ نپے تلے قدم اُٹھاتا، میزوں کے درمیان سے سب کو'' ہیلو ہیلو'' کہتا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مَیں نے اُسے اُس کے فلیٹ تک چھوڑ آنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن اُس نے بتایا کہ وہ منی کیب (ٹیکسی) سے آیا ہے اور اُسی سے لوٹ جائے گا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ رُک گیا اور مڑ کر اُس نے پب کے ماحول کو حسرت سے دیکھا پھر پب کے چاروں کونوں پر نگاہ ڈالی اور مجھے اپنے مخصوص کونے میں پا کر مسکرا دیا۔ دھیرے سے ہاتھ اُٹھا کر ہلایا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔
اُسی رات رمن بھائی نے اپنے پران چھوڑ دیے تھے۔

سرِ راہ

یہ کہانی چار حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ لیکن ہر حصہ آزاد، مختصر، مگر خود میں مکمل ہے، راوی سب کا ایک ہی ہے۔ اس طرز کے انوکھے تجربے فرانسیسی ادب میں عام پائے جاتے ہیں۔ سوچا اس طرز کے تجربے سے اردو ادب کیوں محروم رہے؟

(ج۔ب)

میرے مالک کا نام دامودر نیلے ہے۔ ذات کا وہ دلت ہے اور کھنڈالا گھاٹ سے پونہ جاتے ہوئے راستے میں اُس کا گانو پڑتا ہے۔ لیکن مدت پہلے اُس نے روزی روٹی کی خاطر ممبئی میں اپنا ٹھکانا بنالیا تھا۔ وہ جس علاقے میں مقیم ہے وہ باندرہ کے نام سے مشہور ہے۔ کبھی وہ عیسائیوں کی بستی رہی تھی۔ جگہ جگہ گرجا گھر دِکھتے ہیں۔ خدائی چھٹی کے روز فضا میں گھنٹیوں کی مترنم آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ لیکن زمانہ تو ہر عہد میں کروٹ بدلتا رہتا ہے۔ آبادی بڑھنے پر اب وہاں ہر مذہب، قوم اور ذات کے لوگ آباد ہیں۔ اُن کا وہاں آزادانہ گھومنا پھرنا، ملنا جلنا، لین دین اور میل ملاپ دیش کا سیکولر اور جمہوری نظام کا احساس دِلاتا ہے۔

چوں کہ دامودر جوان تھا۔ ممبئی میں وارد ہوتے ہی اُس نے پانو جما لیے تھے۔ پھر اپنی ذات برادری میں شادی بھی کر لی تھی مگر اُس کی بیوی کسی بھی طور دلت نہیں جان پڑتی تھی۔ اُس کا گندمی رنگ، صاف چہرہ، موہنی صورت ایک ہی زبان بولا کرتی ہیں کہ وہ برہمن یا کھتری زادی ہے۔ مگر غلطی سے وہ دلت پریوار میں پیدا ہو گئی ہے۔ جب کہ دامودر کا سیاہی مائل رنگ، موٹے موٹے ہونٹ، پھولے ہوئے گال اور قدرے پھیلی ہوئی ناک اُس کے دراوڑی (DRAVIDIAN) ہونے کی چغلی کھاتے ہیں۔ وہ ہر صبح گھر سے چلتے وقت مہاتما بدھ کی مورتی کو پھولوں کی مالا ارپن کرتا ہے۔ اُس سے اُس کی دھرم پتنی بھی اپنی اکلوتی بچی کو اُٹھائے اپنے پتی کے برابر آن کھڑی ہوتی ہے۔ پھر وہ آنکھیں موندے، سر جھکائے بھگوان بدھ سے کیا مانگتے ہیں یہ تو رام کی رام ہی جانے۔ مورتی کے پہلو میں باباصاحب امبیڈکر کی تصویر بھی رکھی ہے۔ وہ سیس جھکائے اُس کے آگے گیندے کے پھول رکھتے ہیں۔ مَیں گھر کے باہر احاطے میں کھڑی سمجھ جاتی ہوں کہ چند منٹوں بعد میرا مالک میرے ساتھ ہوگا۔ جس طرح آدمی کا دماغ اُس کے پورے بدن کو قابو میں رکھتا ہے، ویسے ہی میرا مالک مجھے بھی قابو میں رکھتا ہے۔ وہ گیئر بدل کر اور اسٹیرنگ گھما کر مجھے سڑک پر لے آتا ہے اور سیدھا محبوب اسٹوڈیو کی قطار میں لا کھڑا کرتا ہے۔ اُس مقام سے مسافر باندرہ اسٹیشن اور دیگر مقامات کا رُخ کرتے ہیں۔ میرا نمبر آنے پر میرا مالک اپنے بھگوان سے دُعا کرتا ہے کہ سواری لمبے سفر کی ہو۔ یعنی چوپاٹی، اوپیرا ہاؤس، بائیکلہ یا فورٹ ایریا۔ بوہنی اچھی ہو تو جیب گرم رہتی ہے۔ پھر مجھے دوڑانے میں اُس کے پانو بھی خوب چلتے ہیں اور مَیں بھی اپنے کل پُرزوں کے سہارے خوب دوڑتی ہوں۔

مَیں فیئٹ (FIAT) عرف راجکماری اَن گنت چہروں کو روزانہ قریب سے دیکھتی ہوں نوعمر، ادھیڑ، بوڑھے، اُداس، مسرور، سنجیدہ، بے فکرے، ہنستے مسکراتے، زندگی سے تھکے ہارے اور موت کے قریب، سب کی کہانی دوسروں سے الگ رہتی ہے۔ دردناک، غم زدہ، ہولناک، آنسوؤں سے لبریز، خوشگوار۔ اچانک دو خوش شکل خوش پوش مسافر میری طرف آتے دکھائی دیے۔ ایک نے قیمتی پینٹ قمیص پہن رکھی تھی اور اُس کے ہاتھ میں چرمی بیگ تھا۔ دوسرا ادھیڑ عمر

شخص صاف ستھرے پاجامے میں ملبوس تھا۔ چند فائلیں اُس نے اپنے سینے سے لگا رکھی تھیں۔ اُس کے خشک بال ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ دونوں چال ڈھال اور چہرے مہرے سے جہاں دیدہ جان پڑتے تھے۔ کم عمر شخص نے میرے مالک سے نٹ راج ہوٹل چلنے کو کہا۔ مالک خوش ہو گیا کہ شروعات لمبے سفر سے ہو رہی ہے۔ مسافروں نے سگریٹ سلگائے۔ غالباً اُن کا تعلق فلم انڈسٹری سے تھا۔ ایسا میرا خیال تھا اور واقعی میرا قیاس صحیح نکلا، جب کرتے والے شخص نے دوسرے سے دریافت کیا:

''روشن سیٹھ! سننے میں آیا ہے کہ پروڈیوسر سنہا ستر اسی کروڑ کی فلم شروع کرنے کے چکر میں ہے؟''

''آپ کے کانوں نے صحیح سنا ہے.... فلم اگلے ماہ سیٹ پر جا رہی ہے۔ تیاریاں جاری ہیں۔''

''مگر روشن سیٹھ، زیادہ وقت نہیں گزرا، سنہا میرے ساتھ بس کی لائن میں کھڑا تھا۔ پریشان تھا، بتا رہا تھا کہ پچھلی فلم فلاپ ہونے پر اُس کی مالی حالت بہت خراب ہے۔ راشن پانی کے بھی واندے ہیں۔''

''میکش بھائی! آپ فلم لائن کا مجھ سے گہرا تجربہ رکھتے ہو، مگر بعض باتوں میں بڑے بھولے ہو.... فلم لائن میں آدمی کا مقدر ریل بھر میں بدل جاتا ہے۔''

''جانتا ہوں، پُرانی بات ہے.... مگر سنہا کے ہاں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آ گئی؟ کوئی اسمگلر پھانسا ہے کیا؟''

''اسمگلر نہیں، فنانسر۔''

روشن سیٹھ نے سگریٹ کھڑکی سے اُچھال کر اپنی بات آگے بڑھائی:

''اس دُنیا میں ہر انسان کی کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور رہتی ہے۔ مگر اپنی لائن میں ہر بندے کی کئی کمزوریاں ہیں۔''

''یہ بھی پُرانی بات ہے.... مگر برادرم تم فلمی ڈائلاگ مت بولو.... ذرا کھل جاؤ۔''

دونوں نے ہنس کر نئے سگریٹ سلگائے۔ روشن سیٹھ لمبا کش لے کر گویا ہوا:

''بال کی کھال نکالنا آپ کی پُرانی عادت ہے۔''

''جب ہی تو آدمی بات کی تہہ تک پہنچ پاتا ہے۔''

''ٹھیک، تو لو غور سے سنو.... ایک خوشگوار شام میں فنانسر ایڈوانی سنہا کے گھر پر موجود تھا۔ شراب کا دَور چلتا رہا اور ساتھ میں نئی فلم بنانے کے منصوب بھی زیرِ غور رہے.... جب سنہا کو یقین ہو گیا کہ ایڈوانی کے حواس پر عورت سوار ہو چکی ہے اور وہ عورت کے بدن کے لیے تڑپ رہا ہے تو اُس نے رادھا کو فون کیا۔''

''رادھا؟ کون رادھا؟'' میکش چونک اُٹھا۔

''نیا چہرہ، تازہ مال۔ فلم کی ہیروئن۔''

''مگر رادھا تو اُس کی منگیتر ہے؟''

''جانتے ہو تو پھر پوچھتے کیوں ہو؟''

''یا اللہ۔''

یہ کہہ کر میکش اپنی سیٹ سے اُچھل سا پڑا:

''واللہ کیا آئیڈیا ہے فلم کے لیے۔ اس پر دھانسو فلم بن سکتی ہے۔ میرا اگلا اسکرپٹ اسی ٹاپک (TOPIC) پر ہو گا۔ کس طرح فلم کا پروڈیوسر اپنی ہونے والی بیوی کو سیڑھی کی طرح استعمال کرتا ہے اور فلم کا ٹائٹل ہو گا..... زینہ....''

''واہ کیا ٹائٹل ہے۔''

''پسند آیا؟''

''ہاں۔ اسے کل ہی اِمپا[1] (IMPPA) میں رجسٹر کرا دوں گا... مگر میکش بھائی فلم کا اسکرپٹ لکھتے وقت پروڈیوسر کی زبانی یہ کہلوانا مت بھولنا کہ فنانسروں کی کمزوری شراب پی کر ہی جاگا کرتی ہے۔ وہ اپنی کمزوری کے پاس جا کر جب تک اپنی پیاس نہ بجھالیں، چیک پر دستخط نہیں ہوتے۔ پھر جب تک چیک پر دستخط نہ ہوں فلم شروع نہیں ہوتی اور جب تک فلم شروع نہ ہو، پروڈیوسر کے گھر کا کچن نہیں چلتا۔''

دونوں خوشگوار موڈ میں تھے۔ ہنس کر رہ گئے۔ اس پر میکش بھائی نے ایک شعر پڑھ ڈالا:

تخلیقِ کائنات کے حسین جرم پر ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

---

[1] فلم انڈسٹری کا مرکزی دفتر۔

میرے مالک کا شعر و شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، لیکن وہ اُن کی باتوں سے خوش ضرور تھا۔ یوں تو وہ مجھے چلاتے وقت ہر پل اپنی آنکھیں سڑک پر جمائے رہتا ہے، مگر اُس کے کان پیچھے سواریوں کی طرف لگے رہتے ہیں۔ میں چوپاٹی کا موڑ کاٹ کر میرین ڈرائیو پر چلی آئی۔

تاج ہوٹل کے صدر داخلے پر کھڑی میں ساگر کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کی اُچھلتی لہریں چھوٹی سی دیوار سے ٹکرا کر فٹ پاتھ پر پھیل رہی تھیں۔ دن گرم تھا۔ ہوا بند تھی۔ میرا ریڈی ایٹر بھی گرم ہو رہا تھا۔ مالک نے روشن سیٹھ سے کرایہ وصول کر کے میٹر اونچا کیا۔ گیئر میں مجھے ڈالا، عین اُسی وقت ہوٹل کے باوردی سکھ دربان نے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا۔ جوان مرد اور عورت بازو میں بازو ڈالے میری طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ لگا کہ انھوں نے حال ہی میں اگنی کے گرد پھیرے لیے ہیں اور ہنی مون منانے ممبئی وارد ہوئے ہیں۔ مگر عورت کا تعلق ہوائی جہاز کی کسی کمپنی سے ضرور تھا۔ اُس کے چھریرے بدن پر ایر ہوسٹس کا لباس سج رہا تھا۔ اُس کے کندھوں پر سفید بیگ بھی جھول رہا تھا۔ وہ سراپا کشش رکھتی تھی۔ یہی حال مرد کی رُعب دار شخصیت کا بھی تھا۔ لمبا تڑنگا، مضبوط بدن، گھنے بالوں کے ساتھ جاذبِ نظر نقوش۔ میرا مالک حسین جوڑے کو دیکھ کر واقعی خوش تھا۔ حکم ملنے پر اُس نے مجھے باہمے سینٹرل اسٹیشن کی طرف دوڑانا شروع کر دیا۔ عورت نے اپنا سر مرد کے شانے پر رکھ دیا۔ وہ انتہائی مہذب لہجے میں گویا ہوا:

''تم اسٹیشن سے ایر پورٹ کے لیے دوسری ٹیکسی لے لینا۔''

''مگر ڈارلنگ!'' عورت نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی: ''ابھی میری فلائیٹ کے جانے میں کافی وقت ہے.... میں تمھاری بیوی کو ایک بار قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''پھر کبھی دیکھ لینا.... ایسی جلدی بھی کیا ہے؟''

میرا قیاس غلط نکلا۔ ایر ہوسٹس اپنے عاشق کے رویے سے ذرا بھی خوش نہ تھی۔ اُس کا اصرار اپنی جگہ پر قائم رہا۔

''ڈارلنگ ایسا موقع پھر کبھی نہیں آئے گا.... اس سمے ہم اکٹھے ہیں۔ تمھاری بیوی دہلی سے آ رہی

ہے.....تم مجھ پر بھروسا کرو میں تمھاری بیوی کو صرف دور سے دیکھوں گی۔ اُس سے کوئی بات نہیں کروں گی۔''

''مگر ڈیر نینا کپاڈیا....تم میری بیوی کو کیوں دیکھنا چاہتی ہو؟ کوئی وجہ تو ہوگی؟''

نینا نے پہلو بدل کر حسرت سے کہا:

''ارجن ....ہم پچھلے دو برسوں سے مل رہے ہیں۔ تم مجھ پر جان چھڑکتے ہو...مَیں تو صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ تمھاری بیوی میں کون سی ایسی بات ہے، کون سی ایسی خوبی ہے جو مجھ میں نہیں ہے؟''

''نینا یاد کرو۔'' وہ اس کی آنکھوں میں براہِ راست اُتر گیا:

''پہلی بار جب ہم پیرس میں شاں دی لزا کی ایک پب میں ملے تھے تو تم ایرانڈیا کے کریو (CREW) کے ساتھ تھیں اور مَیں ایرونا ٹک انجینئرنگ کی تربیت پانے وہاں گیا ہوا تھا۔ اُس رات مَیں نے تم سے کچھ بھی نہ چھپایا تھا....شادی شدہ ہوں۔ اگنی کے گرد سات پھیرے لے چکا ہوں....تین ماہ کی میری ننھی سی بچی بھی ہے....صبح دم مَیں نے تم سے کچھ اور بھی کہا تھا؟''

''ہاں۔ ایک ایک لفظ یاد ہے مجھ کو۔ تم اپنی بیوی کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ مگر مجبور ہو۔ اُسے چھوڑ نہیں سکتے....اُس کے باپ کے تم پر کئی احسان ہیں۔ پھر اگنی کے گرد لیا ہوا ہر پھیرا خود میں بھرپور معنی رکھتا ہے اور وعدہ بھی۔''

''اس سے ہٹ کر بھی مَیں نے کچھ کہا تھا....مَیں ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اگر تم ساتھ دو گی تو ہم موت تک اکٹھے چل سکتے ہیں....ہمارے بچے ہوئے تو وہ میرے بچے بھی کہلائیں گے...مَیں مرتے دم تک اپنی ذمہ داریاں نبھاؤں گا۔''

لیکن نینا مطمئن ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ جھنجھلا اُٹھی:

''یہ تمام باتیں اپنی جگہ صحیح.... پر تمھاری پتنی کو دیکھنے میں حرج ہی کیا ہے؟....مَیں تم کو دل سے قبول کر چکی ہوں۔ تمھارے ساتھ جیتی ہوں۔ اگر تمھاری پتنی کو ایک بار دیکھ بھی لیا تو اِس میں کون سی بُرائی ہے؟''

مَیں تاردیو کے پُل سے ہو کر اسٹیشن کے احاطے سے دور نہ تھی۔ ارجن نے صدقِ دل سے نینا کو

سمجھانا چاہا:

''غلطی کوئی بھی ہو، چھوٹی یا بڑی، جیون تباہ ہو جاتے ہیں۔ پھر تباہ ہی رہتے ہیں۔''

لیکن نینا پر اُس کے فلسفے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اُکھڑ کر رہ گئی۔

''میں جانتی ہوں تم کیا کہہ رہے ہو... مگر کبھی کبھی تم اتنے خود غرض بن جاتے ہو کہ مجھے سوچنا پڑتا ہے کہ جیون کا سفر تمھارے ساتھ کیسے کٹے گا؟''

مَیں اسٹیشن کے احاطے میں داخل ہو چکی تھی۔ ارجن نے نینا سے کہا:

''فون کرنا۔''

پھر اُس نے میرے مالک سے انتظار کرنے کو کہا اور مزید یہ بھی کہا کہ گاڑی کے آنے پر اُسے اپنی بیوی کو لے کر کولابہ جانا ہے۔ مالک کا تاریک چہرہ اور اُس کی ہلکی ہلکی سفید مونچھیں مسکرا اُٹھی تھیں۔ نینا ارجن کا گال چوم کر اُتر گئی اور بولی:

''کل پُرتگال سے اپنے ٹائم کے گیارہ بجے تمھارے موبائیل پر فون کروں گی۔''

گاڑی دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی پلیٹ فارم پر نمودار ہوئی تو وہاں بھگدڑ مچ اُٹھی۔ سُرخ لباس ہر ڈبے کے ساتھ اُس کا ہینڈل پکڑے بھاگتے دِکھائی دیے اور چھلانگ لگا کر ڈبوں میں داخل ہو گئے۔ مسافر گاڑی سے اُتر رہے تھے۔ نینا اُنھیں بہت قریب سے دیکھ رہی تھی۔ وہ جنگلے سے ٹیک لگائے ارجن اور اُس کی بیوی کا جائزہ لے رہی تھی، جو اُس سے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ وہ بذاتِ خود صبر، غصے اور تاسف سے بھری تھی اور بھری ہی رہی جب تک کہ اُس نے اسٹیشن نہیں چھوڑا۔

کچھ دیر بعد مَیں کولابہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پیاری سی معصوم بچی ارجن کی گود میں تھی۔ وہ بار بار اُس کو چوم رہا تھا۔ کبھی گالوں پر اور کبھی سر پر۔ وہ بھی باپ سے لپٹی الگ ہونے کو تیار نہ تھی۔ ارجن کی بیوی اُس سے لگی بیٹھی تھی۔ آنکھیں نیچے کیے ہی بول اُٹھی:

''ممی ڈیڈی آپ کو بہت یاد کرتے تھے۔''

''اور تم؟''

وہ چھوئی موئی سی بنی جھک کر رہ گئی۔ ارجن نے پہلو بدل کر بیٹی کو سنبھالا اور اپنا بازو بیوی کے کندھے پر پھیلا کر اُسے مزید اپنی طرف کھینچ لیا۔

''تم کیا جانو اُرملا، کتنا یاد کرتا رہا ہوں میں تم کو...رات کاٹنا تو الگ رہا دِن کاٹنا مشکل تھا۔''

چھوئی موئی فخر سے شرمائی اور اپنے فطری حسن سے کھل اُٹھی۔ لیکن میرے مالک کا رنگ بدل چکا تھا۔ اُس کے اختیار میں ہوتا تو وہ مرد کا مکمل فریب، مکمل جھوٹ اور مکمل ریاکاری عورت کے گوش گزار کر دیتا، مگر اُسے تو اپنے کرائے سے غرض تھی۔ دو تین بار کھانس کر اُس نے اپنی سوچ کا زاویہ بدل ڈالا تھا۔

آدھ پون گھنٹے تک میرا مالک سست رفتاری سے مجھے سڑکوں پر دوڑاتا رہا، مگر اُسے کوئی سواری نصیب نہ ہوئی۔ انجام کار اُس نے مجھے ایروز سینما کے قریب لا کر کھڑا کیا اور خود نصف دروازہ کھول کر نشست پر سر رکھے ستانے لگا۔ یہ اُس کا روز کا معمول تھا۔ یکبارگی بادل گھر آئے تھے۔ ہوا بھی بہنے لگی تھی۔ بے موسم کی برکھا آکاش سے اُترنے کی فکر میں تھی۔ ایسے میں مجھے مالک کے بول یاد آ گئے:

''راجکماری! ممبئی کی برسات، فلم والے کی بات اور عورت کی ذات پر کبھی اعتبار نہ کرنا۔''

اتنے میں میرے پچھلے دونوں دروازے کھٹاک سے کھل گئے۔ ایک دروازے سے ڈھلتی عمر کی ایک عورت داخل ہوئی تو دوسری طرف سے ایک صحت مند خوبرو جوان۔ اُس نے نہایت سلیقے سے لباس پہن رکھا تھا۔ قیمتی ساڑھی میں لپٹی ہوئی عورت نے سیٹ پر بیٹھتے ہی مالک سے بڑی نمرتا سے کہا:

''جسلوک ہسپتال لے چلو بھائی.....ذرا جلدی۔''

مالک نے مجھے گیئر میں ڈالنے سے پہلے بیک ویو مرر (BACK VIEW MIRROR) میں دیکھا۔ عورت فکروں میں غلطاں تھی۔ پریشان، اُترا ہوا چہرہ، گود میں رکھے بیگ کو مضبوطی سے پکڑے کھڑکی سے باہر خالی خالی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ جوان شخص بھی گہری سوچ میں غرق

تھا۔ وہ خاموش ناخوش عورت کو متواتر دیکھے جا رہا تھا۔ آخر ہمت کر کے بول اُٹھا:

''ماں! تم نہیں جانتیں، تم کیا کرنے جا رہی ہو۔''

گردن گھما کر وہ بیٹے کو دیکھتی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر آہستہ سے بول اُٹھی:

''اس سنسار میں ہر ماں جانتی ہے، اُسے اپنی اولاد کی خاطر کیا کرنا ہے.....رام، تمھارا بڑا بھائی ہے۔ اس سمے وہ زندگی اور موت کے درمیان سانس لے رہا ہے، لیکن....''

بیٹے نے فوراً مداخلت کی:

''مگر بھیا کے پھیپھڑے جواب دے چکے ہیں۔ اُسے کینسر ہے اور کینسر کا مطلب ایک ہی ہے اس دُنیا میں.... کینسل.... اُس سے آدمی بچ نہیں سکتا.... تم بے کار اُس کا آپریشن کروانا چاہتی ہو۔''

''لکشمن۔'' وہ کافی سنبھل گئی تھی:

''مَیں پڑھی لکھی عورت ہوں۔ جانتی ہوں آدمی ایک لنگ (LUNG) اور ایک کڈنی (KIDNEY) کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ اُس کا ایک پھیپھڑا نکال بھی دیا جائے تو بھی وہ زندہ رہے گا۔''

''کب تک؟ چھ آٹھ مہینے یا زیادہ سے زیادہ ایک برس؟.... مگر یہ بھی تو سوچا ہوتا کہ کتنی بھاری رقم رام بھیا کے آپریشن پر خرچ ہوگی؟.... ہم پہلے ہی اُس کے علاج پر کافی روپیہ خرچ کر چکے ہیں۔ تم بینک سے اُدھار پر اُدھار لیے جا رہی ہو، ہم چکائیں گے کہاں سے؟''

مگر عورت کسی بھی طور مطمئن ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ پورے اعتماد اور جذبات میں ڈوبی بول اُٹھی:

''رام تمھارا بڑا بھائی ہے۔ لیکن میرا گوشت پوست، وہ بھی پہلوٹھی کا.... اُسے بچانے کے لیے اگر مجھے اپنا مکان بھی بیچنا پڑا تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گی.... تم کیا جانو، رام کو پانے میں مَیں نے اور تمھارے پِتا نے کتنی منتیں مانگی تھیں، کتنے جتن کیے تھے۔ ہم اجمیر شریف کی مقدس درگاہ تک گئے تھے..... برسوں بعد میری گود ہری ہوئی تھی۔''

مگر ماں کے جذبات اور ٹھوس دلائل کا بیٹے پر زیادہ اثر نہ ہوا۔ وہ کھڑکی سے باہر آتی جاتی اور چلتی پھرتی دُنیا کو دیکھتا رہا، دیکھتا رہا اور جب مَیں جسلوک ہسپتال سے زیادہ دور نہ تھی، وہ بول اُٹھا:

'' بھیا سے میں بھی پیار کرتا ہوں ماں .... مگر اُس کا بچنا مشکل ہے ..... کینسر بہت پھیل چکا ہے.... آپریشن کے واسطے جو رقم آج تم بھرنا چاہتی ہو اُسے گھر کے کاروبار میں لگاؤ گی تو وہ آگے چل کر پریوار کے کام آئے گی.... تمھارے دوسرے بچے بھی ہیں ماں؟''

'' جانتی ہوں۔ مَیں نے ہی تم سب کو جنم دیا ہے، مگر اس وقت رام کو بچانا ہم سب کا فرض ہے۔''

'' اور اگر آپریشن کامیاب نہ ہوا تو؟''

'' یہ تمھاری سوچ ہے، میری نہیں.... میری منشا تو صاف ہے.... میرا بچہ بھلا چنگا ہو کر مسکراتا ہوا گھر چلا آئے۔ بس مَیں یہی چاہتی ہوں۔''

ہسپتال آ گیا تھا۔ ماں بیٹا بل چکا کر ہسپتال میں داخل ہو گئے تھے۔ مَیں پیڈر روڈ کی چڑھائی چڑھتے، حسین عمارتوں سے گزرتی کیمپس کارنر کی طرف بڑھنے لگی۔ اتنے میں میرے مالک نے مجھ سے کہا:

'' دیکھا راجکماری، ماں کا دل۔ وہ اولاد کو بچانا اپنا دھرم کرم سمجھتی ہے..... جب ہی تو سیانے بولتے ہیں، ماں کے پانو تلے جنت ہوتی ہے۔''

شام ہو چلی تھی۔ مَیں کچھ کچھ تھکی سی پون پُل سے گزر رہی تھی۔ علاقہ اچھا نہیں تھا۔ گانا سننے کے شوقین اور اپنی ہوس مٹانے کے طلب گار اندھیرا گہرا ہونے پر وافر تعداد میں وہاں نظر آتے۔ کانگرس ہاؤس بھی وہاں شان وشوکت سے کھڑا ہے۔ وہ تاریخی عمارت دیش کے بٹوارے کے بعد بھی اُن بدنام گلیوں میں جوں کی توں کھڑی ہے۔ دفتروں کے بند ہوتے ہی اور سورج کے دھیرے دھیرے نیچے جانے پر ٹیکسی کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ اوپیرا ہاؤس کے ایک موڑ پر تین چار آدمی کھڑے ٹیکسی کے لیے ہر طرف نگاہ دوڑا رہے تھے۔ مجھے خالی دیکھ کر بہ یک وقت اُن سب کے ہاتھ فضا میں بلند ہوئے اور مجھے رُکنے کا اشارہ کیا۔ اُن میں ایک موٹا تازہ، لمبا اونچا شخص بھی موجود تھا۔ مالک نے سوچا کہ کہیں مَیں اُس کے وزن سے بیٹھ ہی نہ جاؤں اور مجھے شام دیر تک

وہیں سڑک پر رُکنا پڑے۔ مگر وہ تمام لوگ چہرے مہرے اور پوشاک سے بارُسوخ جان پڑتے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں کلاشنکوف بندوق بھی تھی اور وہ بامبر جیکٹ اور فوجی پتلون پہنے، بھاری بھرکم شخص کے پیچھے کھڑا باز کی مانند ہر طرف نگاہ دوڑا رہا تھا۔ بھاری شخص اپنا وزنی بدن سنبھالے میرے مالک کی برابر والی سیٹ پر براجمان ہوگیا، دیگر تینوں پچھلی سیٹ پر جم گئے۔ مالک چلنے کو تیار کھڑا تھا مگر اُسے حکم کا انتظار تھا۔ وہ سب خاموش تھے۔ مالک نے پوچھا:

''صاحب.... کدھر کو؟''

''ایک دم سیدھا۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کا نہیں..... سمجھا۔''

پیچھے سے بندوق والے کی آواز آئی۔ میری روانگی پر بھاری شخص جو بہترین بدیسی سوٹ میں ملبوس تھا، بمشکل گردن گھما کر بولا:

''بانکے لال۔ مَیں تو تمھاری وجہ سے پھنس گیا۔ چناؤ کا ٹکٹ ملا بھی، تو وہ بھی اُس علاقے کا جہاں سے جیتنا آسان نہیں''

''امرناتھ جی، ممبئی کانگریس کمیٹی میں آپ کے شترو بہت ہیں..... کیا کیا جائے..... کوئی بھی ممبر آپ کے حق میں نہیں تھا۔ پھر پُرانے علاقے کا ٹکٹ آپ کو کیسے ملتا؟''

''مگر مَیں نے تو اپنے علاقے میں بہت کام کیا تھا جناب؟''

''بلڈر لوگوں کی سیما تک.... اکھا جھونپڑپٹی اور کچے پکے مکان آپ نے صاف کرا ڈالے تھے۔ اُس کارن میڈیا نے بھارتیہ کانگریس پارٹی پر خوب کیچڑ اُچھالا تھا۔''

ہلکا سا ملا جلا قہقہہ اُبھرا، مگر امرناتھ کپور کی آنکھیں سُرخ ہوگئی تھیں۔ اب وہ مکمل طور پر گھوم کر بانکے لال سے قدرے تلخ لہجے میں مخاطب ہوا:

''جناب میرے ایسا کرنے سے وہ علاقہ آکاش سے باتیں کرتی بلڈنگوں سے بھر گیا ہے۔ وہ بھارت کا نہیں، باہر کے کسی دیش کا امیر ترین علاقہ دِکھتا ہے۔ نوے فی صد فلیٹ این آر آئی (N.R.I) والوں نے خریدے ہیں۔ دیش کو کروڑوں اربوں کی فارن ایکسچینج حاصل ہوئی ہے۔ کبھی یہ بھی سوچا آپ کی پارٹی نے؟''

''وہ پارٹی تو آپ کی بھی ہے؟''
''ہاں، بے شک۔ اسی وجہ سے تو پارٹی نہیں بدلی۔ بی جے پی والے گھٹنے چومتے چومتے تھک گئے، مگر جس کا دامن تھام لیا سو تھام لیا۔''
بانکے لال کھڑکی سے لگا ڈوبتی شام کی نیم خنک ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اُس نے شیشہ چڑھایا، اپنے کھادی کے کرتے سے ایک کاغذ نکالا، پھر گلا صاف کر کے گوش گزار ہوا:
''پانچ سالوں میں آپ کے دکنی علاقے میں جھگی ربلڈنگ اسکینڈل تو ہوا ہی ہوا۔ پھر اُس کے بعد سڑکوں کا اسکینڈل ..... ٹینڈر پاس ہوا۔ ٹھیکیدار آپ کا اپنا تھا۔ کوئی سڑک نہ بنی ..... ہاں ایک بنی شروع ہوئی تھی۔ وہ بھی پوری نہ ہو پائی ..... ٹیکسی والے گڈھوں کے کارن اُدھر جاتے نہیں۔''
کاغذ پر ایک نظر ڈال کے وہ پھر سے رواں ہو گیا:
''پورا علاقہ رنڈی لوگ سے بھر گیا۔ خوب دھندا چلتا ہے وہاں۔ پولس کا ہفتہ ضرور بندھا ہے.... مگر آپ کے گرگے بھی خوب عیش کرتے ہیں۔ پھر بیکری والوں کا اسکینڈل .....''
''بس بس بہت ہو گیا۔ اسکینڈل کہاں نہیں ہوتے؟ .... سارے دیش میں یہ اسکینڈل کا سلسلہ جاری ہے۔ کون سا نیتا ہے جس پر الزام نہیں؟''
امرناتھ کا لہجہ خاصا تلخ ہو چکا تھا۔ وہ سُرخ چہرہ لیے کئی ایسے انکشافات ظاہر کرنے کے موڈ میں تھا کہ دیکھنے سننے والے دنگ رہ جائیں۔ مگر بانکے لال پر کوئی ردِعمل نہ ہوا۔ اُس نے حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر سہج سبھاؤ سے کہا:
''امرناتھ جی، آپ بھاگیہ شالی ہو۔ ٹکٹ آپ کو مل گیا۔ کمیٹی تو جھگی ربلڈنگ اسکینڈل کے بعد آپ کو ٹکٹ نہ دینے کا فیصلہ کر چکی تھی .... مگر مَیں پُرانا ایجنٹ ہوں۔ میری بھی کچھ ساکھ ہے۔ پھر آپ کی دی ہوئی نوٹوں کی ایک پیٹی بھی اپنا کام کر گئی ..... نہیں تو ٹکٹ ملنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔''
پچھلی نشست پر دونوں مسافروں کے درمیان پھنسا ہوا شخص جو ابھی تک ہر بات کو خاموشی سے بغور سن رہا تھا، اچانک بول اُٹھا:
''پن بانکے لال، یہ تو سوچا ہوتا۔ امرناتھ جی کو تم جدھر کا ٹکٹ دلوایا وہاں ہار ہی ہار ہے ..... دلت

لوگ کا ووٹ ملنا سیدھا کام نہیں.... وہ پاگل لوگ کا ہے کو ایک ہندو پنجابی کو ووٹ دے گا؟''
یہ سننا تھا کہ میرے مالک کے کان کھڑے ہو گئے۔ اسٹیرنگ ادھر اُدھر ہوا تو میں بھی ادھر اُدھر ہونے لگی۔ پھر اسٹیرنگ سنبھلا تو میں بھی سنبھل کر ناک کی سیدھ میں دوڑنے لگی۔ مگر بانکے لال کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔ وہ اپنے بائیں ہاتھ پر بیٹھے شخص سے بے تکلف ہو کر مخاطب ہوا:
''ارے گوردھن، ہر سمسیا کا کوئی حل یا کوئی اُپائے ضرور ہوتا ہے۔ گھاٹ کوپر میں دلت لوگ کا بہت زور ہے مگر اُدھر دوسری جات اور دھرم کے لوگ بھی رہتے ہیں۔ اپنے میاں بھائی بھی وہاں بہت ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ جیت اوشیہ امرناتھ جی کی ہوگی۔''
''نہیں صاحب نہیں، امرناتھ کپور زندگی میں ہمیشہ جیتا ہے۔ مگر اس بار وہ دلت ووٹ کے بغیر نہیں جیت سکتا۔ بار سامنے دیوار پر لکھی ہوئی ہے۔''
''یہی تو میں بھی بولا بانکے لال کو۔ پن یہ سمجھے تو؟''
مگر بانکے لال بھی عجیب خمیر سے اُٹھا تھا۔ چہرے پر کوئی تاثر، کوئی ردِعمل پیدا نہ ہوا۔ یوں بولا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو:
''اس سنسار میں ہر کوئی اپنی کمزوریوں کے ساتھ جیتا ہے..... امرناتھ جی کے نئے علاقے میں دلت برادری کا پرمکھ بھاسکر راؤ ہے۔ دلت لوگ اس کی بات مانتے ہیں..... وہ اپنا متر ہے۔ گلاس بھی اپنے ساتھ ٹکراتا ہے..... امرناتھ جی کی ایک دو نوٹوں کی پیٹیوں سے اوشیہ مان جائے گا ....نہیں تو ماچس کی ایک تیلی سے پورا جنگل جل جاتا ہے۔ ہم اُن کی بستیاں جانتے ہیں۔''
''نہیں صاحب نہیں، امرناتھ کپور کے علاقے میں اس قسم کی گھناؤنی واردات نہیں ہوئی۔ ایسا اتیاچار میں برداشت نہیں کر سکتا۔ بلکہ دیش بھر میں اس قسم کی واردات نہیں ہونی چاہیے۔'
''تو پھر امرناتھ جی۔ دوسرے کئی اُپائے ہیں.... دلت پرمکھ بھاسکر راؤ کے بچے اب پرائیویٹ اسکول میں جانے لگے ہیں..... وہ ایک دن اسکول سے گھر نہ لوٹیں تو پرمکھ کی حالت کیا ہوگی؟''
''ہاں۔ ایسا کچھ کرنے کا اور سوچنے کا۔ نہیں تو یہ سالا دلت لوگ اپن کے سر پر بیٹھ جائیں گا۔''
میرے مالک کے ہاتھ سے اسٹیرنگ چھوٹے جا رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں لرزش پیدا ہو چلی

تھی۔ چہرہ پسینے سے تر ہوا جا رہا تھا۔ ٹیکسی کا اندرونی ماحول، جہاں کچھ پہلے تناؤ ہی تناؤ تھا، اب وہاں بامعنی قہقہے اُبھر آئے تھے۔ میرا مالک حد درجہ پریشان، سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں جو بھارتیہ ناگرک سے اُس کی مرضی کا ووٹ دینے کا حق بھی چھین لینا چاہتے ہیں؟

''اے ڈرائیور۔ گاڑی روکو۔''

بندوق والا شخص بندوق کا زاویہ بدل کر برجستہ بول اُٹھا:

''اُس کالی مرسڈیز کے باجو میں گاڑی لگا دو۔''

مَیں رُک گئی۔ دروازے کھلے۔ مسافر اُترے۔ مرسڈیز کا باوردی ڈرائیور گاڑی کے ساتھ کھڑا تھا۔ سب کو سلام کر کے اُس نے مرسڈیز کے دروازہ کھولے۔ اِدھر گوردھن نے میرے مالک کو نہایت غور سے دیکھا، مسکرایا، پھر بیگ میں سے بٹوے کے ساتھ کیمرہ بھی نکالا۔ کرایہ اور بھاری ٹپ چھوڑنے پر نمبر پلیٹ کی تصویر کھینچی اور دیکھتے ہی دیکھتے دو تین تصویریں میرے مالک کی بھی اُتار لیں۔ اس پر بھی اُس کی تسلی نہ ہوئی تو وہ اپنا مدقوق چہرہ میرے مالک کے قریب لے آیا۔ دھیمے سے اپنے بول اُس کے کانوں میں ڈالتا چلا گیا:

''تم آج جو سنا، وہ نہیں سُنا.... تم ہم لوگوں کو دیکھا وہ بھی نہیں دیکھا.... ہم تیری ٹیکسی میں بیٹھا وہ بھی نہیں بیٹھا۔ سمجھا.... تو منہ کھولا تو تیرے ساتھ تیرا پریوار بھی....''

میرے مالک کی ذہنی حالت اتنی غیر ہو چکی تھی کہ اُس کے اندرون کے ساتھ اُس کا شریر بھی کانپ اُٹھا تھا۔ اُس کے اطراف تاریکی پھیل رہی تھی۔ مرسڈیز کے روانہ ہوتے ہی مالک نے مجھے اسٹارٹ کرنا چاہا، مگر بے سود۔ اُس کے ہاتھ پانو برابر ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اگلی کوشش پر گاڑی تو اسٹارٹ ہو گئی مگر مالک نہیں جانتا تھا کہ وہ کس مقام کی کس سڑک پر کھڑا ہے اور اُسے کون سا راستہ اختیار کر کے گھر پہنچنا ہے۔ اتنے میں آسمان پر زور سے بادل گرجے۔ بھیانک شور ہوا۔ بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں اُتریں، پھر تیز دھار ونڈ اسکرین پر پھیل گئی۔ آسمان رو رہا تھا۔ مَیں اور میرا مالک بھی اُس میں برابر کے شریک تھے۔

☆☆

ماں، بیٹی اور باپ

کچھ دیر پہلے وہ میرے کمرے میں آیا تھا۔ لیکن مجھے سوچ کی بھول بھلیوں میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ میرا ذہن کافی تھک چکا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر کہ وہ جوان، جس کے ساتھ میرا تعلق برائے نام ہی ہے، وہ کس غرض سے میرے پاس آیا تھا؟ مجھ سے کیا توقع رکھتا تھا اور اپنا مقصد بیان کیے بغیر ہی کیوں چلا گیا تھا؟ مَیں ہر سوال کے ہر پہلو پر سنجیدگی سے غور کرتا رہا، لیکن اُن کا جواب تو درکنار، کوئی بھی سِرا میرے ہاتھ نہ لگا۔ ذہن بھی عجیب شے ہے۔ ایک بار سوچنا شروع کردے تو لاکھ روکنے پر بھی نہیں رُکتا۔ کوئی نہ کوئی نکتہ کہیں نہ کہیں سے اُبھر کر سوچ کے دائرے میں پھیل جاتا ہے۔ طرح طرح کے اُلٹے سیدھے خیالات اور شبہات پریشان کرنے لگتے ہیں۔ وہ جوان شخص جب میرے روبرو بیٹھا ہوا تھا تو وہ اُداس، متفکر اور بجھا بجھا سا تھا۔ گردن جھکائے گہری سوچ میں غرق تھا۔ اُس کے لب کچھ کہنے کو ضرور اُوپر نیچے ہوا کرتے لیکن وہ کہتے کہتے اچانک رُک جاتے اور کمرے میں طویل خاموشی چھا جاتی۔ وہ اس قدر UP SET تھا کہ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنی بات کو شروع کہاں سے کرے؟ یقیناً کوئی وزنی بات اُس کے

سینے پر بوجھ بن بیٹھی تھی، جسے وہ اُگلنے سے ہچکچا رہا تھا۔ مَیں نے اُس کی پریشانی اور گھبراہٹ کو دور کرنا چاہا:

''ہم ایک دوسرے کو زیادہ تو نہیں جانتے.... مگر تم ایک پڑوسی ہونے کے ناتے میرے پاس آئے ہو.... جو بھی کہنا ہے بے دھڑک کہو۔''

''وہ...وہ... میری ماں....؟''

''کیا ہوا تمھاری ماں کو؟''

لیکن جواب دینے کی بجائے اُس نے ادھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ میرے پلنگ کے قریب میلے کچیلے کپڑے، میز پر اَن گنت بے ترتیب کتابیں، رسالے، ایک کونے میں بیئر کے خالی ڈبے، خالی بوتلیں، کوفی ٹیبل پر سگریٹوں سے بھری ہوئی ایش ٹرے، بکھری ہوئی راکھ اور دیواروں پر دھول سے اَٹی ہوئی تصویروں کو وہ دیکھتا ہی چلا گیا۔ مَیں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ میرے کمرے کا جائزہ کیوں لیے جا رہا ہے؟ ممکن ہے وہ میرا معیارِ زندگی جاننا چاہتا ہو، یا میرا رہن سہن؟

''تم نے بتایا نہیں کیا ہوا تمھاری ماں کو....؟''

''وہ...وہ...کل اُس کا دیہانت ہو گیا ہے۔''

''او مائی گاڈ.... مَیں نے صدقِ دل سے ہمدردی جتائی.... مجھے واقعی افسوس ہوا مگر اِس معاملے میں تمھارے واسطے مَیں کیا کر سکتا ہوں؟''

لیکن اُس نے جواب دینے کی بجائے ہاتھ بڑھا کر میز سے میرا سگریٹ کا پیکٹ اُٹھا لیا۔ مَیں نے بُرا نہیں مانا کہ وہ بے حد پریشان تھا۔ سگریٹ سلگا کر وہ وقفے وقفے سے لمبے لمبے کش کھینچتا رہا۔ پھر اچانک خود میں کھو گیا۔ لگا کہ وہ سات سمندر پار کہیں دور نکل گیا ہے اور واپس لوٹنے میں اُسے وقت لگے گا۔ مَیں اُس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو صحیح تناظر میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ مگر اتنا ضرور جان چکا تھا کہ اُس کے ضمیر پر کوئی بوجھ ہے جو اُسے اپنا اندرون بیان کرنے سے روک رہا ہے۔ لیکن وہ جلد ہی سات سمندر پار سے لوٹ آیا تھا۔ اُس نے غیر یقینی پن سے مجھے دیکھا اور دیکھتا ہی چلا گیا۔ پھر سگریٹ بجھا کر تیزی سے اُٹھا اور دروازہ بند کر کے جا چکا تھا۔ مجھے اتنا بڑا ذہنی جھٹکا اپنی زندگی میں

کبھی نہیں لگا تھا۔ وہ ایک پیچیدہ، نا قابلِ فہم معمہ بنا میری سوچ میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ جب کہ میں اُس کی بابت بس اتنا جانتا تھا کہ وہ میرے بغل والے بیڈ سیٹ (BEDSIT) میں رہائش پذیر ہے۔ میری ہی طرح اس مکان کا لاجر ہے۔ جو شے ہم دونوں میں مشترک تھی وہ ہمارا صدیوں پُرانا فطری سانولا سلونا رنگ تھا۔ وہ مقامی باشندوں کے لیے اتنا گمبھیر مسئلہ تھا کہ وہ اس سے چھٹکارا پانے کی ہر ممکن تدبیر کر چکے تھے۔ مگر تھک ہار کر جان گئے تھے کہ یہ رنگ اب اُن کی سرزمین کا حصہ بن چکا ہے۔ اُن کے ساتھ ہی جیے گا اور ساتھ ہی مرے گا۔ اُس جوان شخص کا رنگ مجھ سے قدرے گہرا تھا۔ اُس کے نین نقش سے واضح تھا کہ وہ بھارت کے صوبۂ بنگال کے کسی علاقے سے ہے۔ پھیلی ہوئی سرمئی آنکھیں، اُبھرے ہوئے ہونٹ، ہلکی سی بیٹھی ہوئی ناک، گھنگھریالے بال اور درمیانہ قد، مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ بھارت کا باسی ہے یا بنگلہ دیش کا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ دُنیا کے کسی الگ خطے سے وارد ہوا ہو؟ اس لیے کہ یہ رنگ تو دُنیا کے ہر خطے میں اپنے پانو جما چکا ہے۔ اس جوان کو اِس مکان میں رہتے ہوئے آٹھ دس ماہ بیت چکے تھے۔ لیکن مَیں اُس سے شاذونادر ہی ملا تھا۔ وہ بھی محض اتفاقاً۔ کبھی لاؤنج میں کبھی لینڈنگ میں۔ کبھی کچن میں اور کبھی سیڑھیاں چڑھتے اُترتے ہوئے۔ اور ہم ''ہیلو ہیلو'' کہہ کر آگے بڑھ جاتے۔ یہیں سے ہمارا رشتہ شروع ہو کر یہیں ختم ہو جاتا اور مَیں اپنے کمرے میں پہنچ کر اُسے یکسر فراموش کر بیٹھتا۔ لیکن مَیں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ کسی روز اُسے روک کر دریافت کروں گا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے؟ خود کو زندہ رکھنے کی خاطر کیا کرتا ہے؟ اکیلا ہے یا شادی شدہ ہے؟ اُسے انگلینڈ آئے ہوئے کتنی مدت ہوئی ہے؟ لیکن مجھ کو اتنی فرصت ہی کہاں تھی۔ میرا جیون تو پرندوں کی مانند تھا، جو بھور ہوتے ہی آب و دانہ کی تلاش میں پرواز کر جاتے ہیں اور سانجھ ڈھلنے پر ہی گھونسلوں میں لوٹا کرتے ہیں۔ لیکن مَیں تو پرندوں سے بھی چند ہاتھ آگے نکل گیا تھا۔ مَیں دوسرے پہر کام شروع کر کے اُس پہر لوٹا کرتا جب شہر کے تمام علاقے بے رونق، بے آواز اور بے جان ہوا کرتے اور آدمی خاموش سڑکوں پر خود سے ہمکلام اپنے در پر آن کھڑا ہوتا۔ چھ دنوں تک مَیں وزنی مشینوں، فورک لفٹوں، روبوٹوں اور ٹرالیوں میں گھرا رہتا۔ مگر ساتواں دن ہر اعتبار سے میرا اپنا ہوتا۔ یہی سوچتے سوچتے

میرا ذہن مکان کے ماحول میں کھوگیا۔ دو منزلہ وکٹورین مکان کی لینڈ لیڈی ایک یہودن تھی۔ بنام این روزن برگ۔ دوسری جنگِ عظیم کے آغاز میں نازی فوجیں جب پولینڈ میں بلا کسی مدافعت کے داخل ہوکر وارسا تک پہنچ گئی تھیں تو مسز روزن برگ اپنی شیر خوار بچی کو ایک بیگ میں چھپا کر ہزار مصیبتوں کو جھیلتی ہوئی سرحد کو پار کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ اُس کا شوہر پیچھے رہ گیا تھا کہ وہ مزاحمتی تحریک کا سرگرم رُکن تھا۔ لیکن وہ جلد ہی نازیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوکر بکن والڈ (BUCHENWALD) کنسنٹریشن کیمپ میں بھیج دیا گیا تھا۔ جہاں اُس کی ہڈیوں تک کا پتہ نہ چلا تھا۔ اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تو مَیں مکان اور لینڈ لیڈی کے پس منظر سے نکل آیا۔ پورا یقین تھا کہ وہ جوان شخص دروازے پر کھڑا معافی مانگنے کی غرض سے چلا آیا ہے۔ یقیناً وہ اپنے کیے پر شرمسار ہے اور اپنی اَن کہی بات کہہ کر اپنا ضمیر صاف کرنا چاہتا ہے۔ لیکن مَیں...؟؟ اُسے دروازے سے ہی چلتا کردوں گا، یہ کہہ کر کہ تعلقات بنانے اور بڑھانے کی ابتدا اگر صحت مند نہ ہوتو کنارہ کشی بہتر ہوا کرتی ہے۔ لیکن دروازہ کھولا تو میگی دہلیز پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ننھی سی گڑیا کا شگفتہ چہرہ مسکراہٹ سے بھرا ہوا تھا۔ بن بیاہ کی بچی کو دیکھ کر میرا سارا غصہ کافور ہوگیا اور میری ذہنی حالت بدل کر رہ گئی۔ مَیں نے ہاتھ بڑھا کر اُسے اُٹھالیا۔

''ہیلو مائی لِٹل اینجل۔ (HELLO MY LITTLE ANGEL)''

اُس نے اپنے ننھے بازو میری گردن کے گرد پھیلا دیے۔ وہ خدائی چھٹی کے روز میرے پاس ضرور آیا کرتی۔ موسم خواہ کوئی بھی رہا ہو۔ گرم یا سرد۔ حتیٰ کہ برف باری کے دوران بھی وہ میرے در پر آن کھڑی ہوتی۔ دراصل اُس معصوم بچی کا لالچ اُسے کھینچ کر میرے پاس لے آتا۔ مَیں اُس کا ہاتھ تھام کر ہائی اسٹریٹ کی طرف بڑھ جاتا۔ اپنے واسطے اخبار، سگریٹ اور ماچس خریدتا اور اُس کے واسطے اُس کی دل پسند چاکلیٹ، کرسپ اور کینڈی یا لولی۔ بارہا مَیں نے محسوس کیا تھا کہ مَیں جب تک اس مکان میں رہوں گا تب تک مجھ کو اپنی پسند اور پیار کا ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ لیکن مجھے روحانی خوشی ہوتی کہ مَیں اُس بچی کو پیار دے رہا ہوں جو اپنے باپ کی شفقت سے محروم رہ گئی ہے اور اُسے فادر فگر کی سخت ضرورت ہے۔ مَیں نے اُسے خود سے الگ کر کے کہا:

''بس مجھے تھوڑا سا وقت دے دو پھر چلتے ہیں؟''

وہ مجھ کو شب خوابی کے لباس میں دیکھ کر سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ جھٹ سے آنکھیں بند کر کے بول اُٹھی:

''ٹھیک ہے تم کپڑے بدل لو۔ میں تب تک آنکھیں بند رکھوں گی۔''

میں اُس کی دل کش ادا پر ہنس دیا اور ہلکی سی چپت اُس کے گال پر رسید کی۔

''میگی تم بڑی ہوشیار ہو، اپنی ماں کی طرح.... جاؤ تھوڑی دیر بعد آنا؟''

وہ اقرار میں گردن ہلا کر اُچھلتی کودتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی جو بالکل میرے کمرے کے مقابل تھا۔ وہ اُس منزل کا سب سے کشادہ فلیٹ نما کمرہ تھا، صاف ستھرا قرینے سے سجا ہوا۔ ٹائلیٹ، شاور اور مختصر سا کچن بھی اُس میں شامل تھا۔ میگی جتنی معصوم تھی اُس سے کہیں زیادہ شریر بھی تھی۔ اُس کی شرارتیں بعض دفعہ اُس کی ماں باربرا کے واسطے وبالِ جان بن جاتیں۔ اُس سے وہ مادرانہ پیار، محبت، ممتا غرض یہ کہ ہر جذبہ فراموش کیے اپنی بیٹی کو دیوانہ وار پیٹتی چلی جاتی۔ میگی چیختی چلاتی۔ اُس کا رونا دھونا سُن کر میرا ایک ہی ردِ عمل ہوتا کہ باربرا اپنی بیٹی کو پیٹنے کی بجائے خود کو، اپنے حالات کو اور اپنے مقدر کو پیٹ رہی ہے۔ راہِ شوق میں اُٹھایا ہوا قدم کتنا مہنگا پڑتا ہے؟ اور اُس کی کتنی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے؟ یہ تجربہ اور مشاہدہ مجھے مسز روزن برگ کے مکان میں رہ کر ہوا تھا۔ باربرا حسین عورت تھی۔ ہوشمند، تعلیم یافتہ، متوازن ذہن رکھتی تھی۔ مگر اُس کا جیون ایک ایسے خطرناک موڑ سے گزر چکا تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی وَن پیرنٹ فیملی (ONE PARENT FAMILY) بن کر رہ گئی تھی۔ انجام یہ ہوا کہ اُس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ پریشان باربرا صبر، جبر، جھلاہٹ اور جستجو کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔

مَیں جن دنوں نیا نیا اس مکان میں رہنے آیا تھا، میگی ابھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوئی تھی۔ ایک دو قدم اُٹھا کر جسمانی توازن کھو بیٹھا کرتی اور لڑھک کر زمین پر پھیل جاتی۔ باربرا برآمدے میں اُس کا ہاتھ تھامے اُسے چلانے کی مشق کرایا کرتی تھی۔ مجھ کو وہاں پا کر میگی کا چہرہ

کھل اُٹھتا۔ وہ ماں کی اُنگلی چھڑا کر پوری طاقت سے میری طرف ہمکنے کی کوشش کرتی۔ مَیں فوراً ہی اُسے گرنے سے قبل اُٹھا کر گلے لگا لیتا اور اُسے جی جان سے پیار کرتا۔ وہ اُن دنوں بھی اپنی ننھی ننھی بانہیں میرے گلے کے گرد پھیلا دیا کرتی تھی۔ بار بار ہم دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر بے حد و حساب خوش ہوتی۔ مگر کبھی کبھی اُداسی بھی اُس کے پورے وجود کو گھیر لیتی۔ ایک بار اُس نے مجھ سے کہا تھا:

''میگی تمھاری دوست ہے، تم کو بہت پسند کرتی ہے۔''

''ہاں وہ مجھ کو جانتی ہے، پہچانتی ہے۔ کسی جنم میں میرا اور اُس کا سمبندھ بہت گہرا رہا ہے۔''

''اور اس جنم میں تم پُرانا قرض چکانے چلے آئے ہو؟''

اُسے اپنا خیال اتنا پسند آیا کہ وہ بے ساختہ ہنسنے لگی۔ ایسا لگا کہ وہ کھلے بندوں میرا مذاق اُڑا رہی ہے۔ مَیں نے اُسے اپنی مذہبی کتابوں اور عقیدوں کا حوالہ دینا ضروری جانا۔

''مَیں جانتا ہوں تم ان باتوں میں یقین نہیں رکھتیں؟ مگر ان میں بڑی سچائی ہے۔ کئی جنم تک آتماؤں کا ملن آپس میں رہتا ہے۔''

''ہاں۔ اور تم کو یہ بھی بتا تا چلوں کہ انڈیا کے چار بڑے مذہب ہندومت، بدھ مت، جین مت اور سِکھ مت یقین رکھتے ہیں کہ منُش مرنے کے بعد اگلا جنم ضرور لیتا ہے اور اُس کی آتما کا فیصلہ اُس کے پچھلے جنم کے کرم کرتے ہیں کہ وہ کس کوکھ میں پرویش کرے گی۔''

''اچھا؟ .... مگر فی الحال تو مَیں یہ چاہتی ہوں کہ میگی جھٹ سے بڑی ہو جائے اور اسکول جانا شروع کر دے تا کہ مَیں پارٹ ٹائم کام کر کے اپنی زندگی سنوار پاؤں۔''

مَیں اُس کی مجبوریوں سے کماحقہٗ واقف تھا۔ لیکن مجھ سے یہ برداشت نہ ہوا کہ وہ میرے دیش کے مذاہب کا مذاق اُڑائے۔ مَیں یہ سوچ کر خاموش ہو گیا کہ اس موضوع پر پھر کبھی اُس سے اُلجھ کر اُس کی آنکھیں کھولوں گا۔

اُن دنوں میرے پاس بڑے مزے کی ملازمت تھی۔ کام کے اوقات بڑے سوشل تھے۔ پانچ دن کا کام تھا اور ہر شام میری اپنی ہوا کرتی تھی۔ مجھے لکھنے پڑھنے کا بھی خاصا وقت مل جایا کرتا تھا اور

مَیں اپنے آئندہ ناول کے لیے نوٹ لے رہا تھا۔ تین چوتھائی نوٹ سپرِدِ قلم ہو چکے تھے۔ میری انتخاب شدہ منزل مجھ سے دور نہ تھی، جس کی خاطر مَیں پردیس میں پیسا کمانے کی غرض سے آیا تھا۔

مکان کی دوسری منزل پر لندن یونیورسٹی کے دو طالب علم بھی رہائش پذیر تھے۔ ایک ایرانی نژاد تھا اور دوسرا ہانگ کانگ کا اینگلو چائنیز۔ دونوں کی رگوں میں جوانی کا گرم خون دوڑ رہا تھا۔ اور دونوں باربرا کے قریب آنے میں کوشاں تھے۔ لگتا تھا کہ اُن کے درمیان باربرا کو جیتنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ مگر باربرا کے اپنے فرینڈز تھے اور بوائے فرینڈز بھی۔ کوئی کوئی ویک اینڈ وہ اُن کے ساتھ گزارا کرتی تھی۔ میگی کو وہ مسز روزن برگ کے پاس چھوڑ جاتی اور خود ذاتی محرومیوں سے وقتی فرار اور وقتی تسکین پا کر خوشی خوشی لوٹا کرتی۔ لیکن میگی کو مسز روزن برگ کے پاس چھوڑ جانے کے مقررہ دام اُسے ادا کرنے ہوتے۔ چوں کہ دونوں طالب علم امیر گھرانوں کے فرزند تھے۔ باربرا کو اکثر کبھی پب میں، کبھی ریسٹورنٹ میں اور کبھی کلب میں چلنے کی دعوت دیتے۔ وہ انکار نہ کرتی مگر اُن کی منشا سے خوب خوب واقف تھی۔ اُس نے اپنے اور اُن کے درمیان اخلاقی لکیر کھینچ رکھی تھی۔ دونوں طالب علم باوجود کوشش اور تحفے تحائف دے دلا کر بھی اُس لکیر کو عبور کرنے میں کامیاب نہ ہو پائے۔ باربرا کا سوچا سمجھا سخت رویہ تب تک قائم رہا جب تک کہ وہ طالب علم یونیورسٹی سے سُرخ رو ہو کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ نہیں گئے۔ دراصل باربرا نے شخصیت ہی کچھ ایسی پائی تھی کہ ہر کوئی اُسے دیکھ کر پگھل جایا کرتا تھا۔ اُن میں ایک مَیں بھی تھا۔ گورے چٹے بدن پر نیم سُرخ چہرہ، حساس بلوریں آنکھیں، اُٹھی ہوئی مخصوص برطانوی ناک، تنی ہوئی چھاتیاں اور گھنے بال۔ اُس کا کسا ہوا بدن دیکھ کر گمان گزرتا کہ وہ ابھی تک کنواری ہے، اَن چھوئی ہے اور کسی یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ ہے۔ لیکن جانے کیوں اُس کا رویہ میرے ساتھ مختلف تھا۔ دوستی کے ساتھ چاہت کا عنصر بھی شامل تھا۔ مَیں بھی اُسے اُسی سطح پر دیکھا کرتا۔ وہ بلا تکلف میرے ساتھ الگ الگ موضوع پر بات کیا کرتی۔ سیکس بھی زیرِ گفتگو رہتا اور وہ اُسے بڑا صحت مند سمجھا کرتی۔ اکثر کہا کرتی کہ آدمی اگر سیکس کی اہمیت کو سمجھ نہ پائے یا اُس سے محروم رہ

جائے تو وہ اپنی سوچ کا توازن بھی کھو بیٹھتا ہے۔ خواہ وہ شخص شادی شدہ کیوں نہ ہو؟ سیکس سے حظ اُٹھانا نہایت ضروری ہے۔ اُس کا اندازِ گفتگو، اُس کی میٹھی آواز اور اُس کی خوبصورتی نے مجھ کو اتنا متاثر کیا تھا کہ مَیں اپنے تصور میں بار ہا اُس کے بدن سے لپٹ چکا تھا۔ اُس کا انگ انگ قریب سے دیکھ چکا تھا۔ اُسے مکمل پانے کی شدت میرے ہاں شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن میری سائیکی اور خصوصاً لاشعور میں یہ خوف بھی بیٹھا ہوا تھا کہ اگر مَیں زندگی کے سفر میں باربرا کے ساتھ کہیں بھی اٹک گیا تو میرے وہ منصوبے جنھیں مَیں جلد یا بدیر عملی شکل دینا چاہتا ہوں، ادھورے ہی رہ جائیں گے اور مجھے آخری سانس بھی پردیس میں لینا ہوگی۔ لہٰذا مَیں نے خود پر جبر کیا۔ اپنے تن من کو مارا اور باربرا کو اپنی کمزوری کا احساس نہ ہونے دیا۔ لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔ وہ چور دروازے سے میرے دل میں داخل ہوئی، مجھے ٹٹولا، پرکھا اور جلد ہی اُسے میری ڈھکی چھپی خواہش کا سراغ مل گیا۔ وقتاً فوقتاً اُس کے اصرار پر یا میگی کی ضد پر مَیں اُن کے ساتھ شاپنگ کو چلا جاتا۔ میگی میرا ہاتھ تھام کر ہی چلنے میں خوش ہوا کرتی۔ بعض دفعہ اُس کے تھک جانے پر مَیں اُسے اُٹھا کر اپنی گردن کی پشت پر بٹھا لیتا۔ وہ خوشی خوشی میرا سر پکڑے رکھتی اور مَیں مضبوطی سے اُس کی ٹانگیں تھامے چلتا رہتا۔ میگی کے ساتھ باربرا بھی ہنسا کرتی۔ مجھے بھی آنند ملتا۔ لیکن مقامی لوگ جب ماں بیٹی کو ایک رنگ دار شخص کے ساتھ دیکھتے تو اُن کے چہرے کے تأثرات بدل جاتے۔ وہاں کبھی نفرت، کبھی ناپسندیدگی اور کبھی خفگی اُمڈ آتی تو مجھ کو اندر باہر سے چھلنی کر ڈالتی۔ اِس کا ذکر مَیں باربرا سے کرتا تو وہ جھلا اُٹھتی:

''اگر تم اِن باتوں کا نوٹس لیتے رہو گے تو یہ لوگ تمھارا جینا مشکل کر دیں گے۔ تمھارا تعلق مجھ سے ہے، میگی سے ہے، یہاں کے لوگوں سے نہیں۔''

بات اُس کی معقول تھی اور اُس میں منطق بھی تھی۔ میرا تعلق واقعی اُن ہی کے ساتھ تھا۔ جو روز بروز جڑ پکڑ رہا تھا۔ لیکن بیک وقت مجھے محتاط بھی کیے جا رہا تھا۔ ماں، بیٹی کی صحبت میں گھومتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے اور کھاتے پیتے یہ احساسات تیزی سے پنپ رہے تھے کہ جس رفتار سے ہم ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں، مَیں اُن کی فیملی کا حصہ بنتا جا رہا ہوں۔ جانے یہ سلسلہ کہاں جا کر

ختم ہوگا؟

کوئی شام ایسی نہ گزرتی جب میگی کھلونے اُٹھا کر میرے کمرے میں نہ چلی آتی۔ میں اپنے ناول کے نوٹ لیتا رہتا اور وہ اپنی توتلی زبان میں کھلونوں سے باتیں کرتی اُن کے ساتھ کھیلتی رہتی۔ جب کبھی میرے ہاں کوئی ذہنی اُلجھن پیدا ہو جاتی تو میں تھوڑی دیر کے لیے قلم رکھ کر ننھی سی جان کے ساتھ کھیلنے لگتا۔ مجھے اُس پر رہ رہ کر پیار آتا تھا۔ بلکہ وہ میری سانسوں میں شامل ہوتی جا رہی تھی۔ اُس بدنصیب نے تو اپنے باپ کے ہاتھوں کا لمس بھی نہ پایا تھا۔ وہ ابھی گوشت پوست کی شکل اختیار ہی کر رہی تھی کہ اُس کا باپ، ماں بیٹی کو اکیلا چھوڑ کر منظر سے اچانک ہی غائب ہو گیا تھا۔ وہ آزاد منش آدمی تھا۔ بڑھتی ہوئی ذمہ داری کو قبول کرنا اور پانو میں مشکل بیڑی پڑنے سے گھبرا گیا تھا۔ باربرا کی دُنیا دور دور تک ویران ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنے محبوب اور میگی کے باپ کو جگہ جگہ تلاش کیا، مگر بے سود۔ پتہ چلا کہ وہ کینیڈا کی طرف کہیں نکل گیا ہے۔ باربرا چاہتی تو وہ میگی سے بروقت نجات حاصل کر سکتی تھی۔ ایک بار اُس نے مجھ سے کہا بھی تھا:

میگی سے چھٹکارا پانا میرے واسطے مشکل نہ تھا۔ مگر عمر بھر کا بوجھ ضمیر پہ لیے میں جینے کے حق میں نہ تھی۔''

''مگر تم رومن کیتھولک تو نہیں ہو؟''

''ہاں۔ میں پروٹسٹنٹ ہوں.... مگر جیون کی ہتیا کرنا نہایت بُرا سمجھتی ہوں۔''

ایک شام میں اور میگی کھیل کود میں اتنے مگن تھے کہ مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ باربرا کب کمرے میں داخل ہوئی اور کب سے دروازے پر کھڑی ہم دونوں کو دیکھے جا رہی ہے۔ آنکھیں چار ہوئیں تو اُس کا چہرہ خوشیوں سے بھرا ہوا تھا۔ گہری نظروں سے مجھ کو تکتی رہی۔

''اتنا پیار تو میں بھی اپنی بیٹی سے نہیں کرتی، جتنا تم کرتے ہو۔''

''میں نے تم سے کہا تو تھا۔ یہ ہمارے اچھے کرم تھے، جن کے کارن ہم پھر سے مل بیٹھے ہیں۔''

''میں تمھاری ایسٹرن فلاسفی سے خاصی بور ہو چکی ہوں۔ لیکن میگی کو تمھارے ساتھ جڑا ہوا دیکھ کر

مجھے کچھ کچھ یقین سا ہو چلا ہے۔"
وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ خاموش، سنجیدہ، فکرمند۔ ٹکٹکی باندھے کبھی میگی کو دیکھتی اور کبھی مجھے۔ وجدان سا ہوا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت میرے پاس آئی ہے؟ حالاں کہ وہ بلا کسی روک ٹوک کے میرے ہاں چلی آیا کرتی تھی اور گھنٹوں مجھ سے باتیں کیا کرتی تھی۔ لیکن اُس شام، اُن مخصوص لمحوں نے مجھے اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا۔ بار بار اُنے سگریٹ سلگائی۔ کچھ سوچا، پھر تلخی سے کہا:
"میں دُنیا کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتی۔ I GIVE A DAMN ۔ لیکن مجھ کو ہر دم میگی سے ڈر لگا رہتا ہے۔"
"میگی سے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں۔ وہ تیزی سے بڑی ہو رہی ہے۔ سال دو سال میں اسکول جانا شروع کر دے گی تو بچے اُسے لَو چائلڈ (LOVE CHILD) کہہ کر چھیڑا کریں گے؟ اُس کا مذاق اُڑائیں گے؟"
مَیں چونک اُٹھا۔
"شاید تم نہیں جانتے ہماری سوسائٹی میں لَو چائلڈ کتنی بڑی گالی ہے۔ لَو چائلڈ کا مطلب ہے باسٹرڈ چائلڈ آؤٹ آف ویڈلاک (حرامی بچہ بنا شادی کے جنا ہوا)۔ مَیں اس خیال سے ہی کانپ اُٹھتی ہوں، جب کوئی میری بچی کو اُس نظر سے دیکھے گا۔"
قریب ہی میگی بیٹھی کھلونوں سے کھیل رہی تھی، یہ جانے بغیر کہ اُس کے متعلق سنجیدگی سے بات ہو رہی ہے۔ مجھے اُس معصوم پر زیادہ ہی ترس آ رہا تھا۔
"ذرا سوچو اُس وقت میگی کی کیا حالت ہوگی؟.... مَیں اُسے کیا جواب دوں گی؟ کیسے FACE کر پاؤں گی اُسے؟"
مَیں کیا جواب دیتا؟ پرابلم اُس کی تھی اور مجھے کسی بھی طور اُس کی پرابلم کا حصہ بننا منظور نہ تھا۔ لیکن سرِدست سوال میگی کا تھا اور مَیں اُس کے لیے نرم گوشہ رکھتا تھا۔ میرے ذہن میں طوفان سا اُمڈ آیا۔ کچھ سوچ کر گویا ہوا:

''میگی کو باپ کے نام کے ساتھ ایک باپ کی بھی ضرورت ہے۔ تم کو چاہیے کہ جلدی سے شادی کر ڈالو۔''

''ارادہ تو میرا بھی یہی ہے... مگر تم جانتے ہو مَیں ایک بار آگ کے دریا سے گزر چکی ہوں۔ کیسی کیسی مصیبتیں مَیں نے جھیلی ہیں۔ ہر قدم پر یہی محسوس ہوا کہ IT IS STILL A MEN'S WORLD... ڈرتی ہوں میرا انجام پھر ویسا نہ ہو؟''

باربرا کے نظریات کو جان کر اور اُس کے ڈر کو قریب سے محسوس کر کے ہمدردی کا پیالہ لبریز ہو گیا تھا۔

''باربرا! ڈر ایک ایسا بھیانک جذبہ ہے جو آدمی کے قریب دیوار بن کر کھڑا رہتا ہے اور وہ شخص کوئی بھی قدم اُٹھا نہیں پاتا.... تم یہاں کی دُنیا کو، یہاں کی سوسائٹی کو اندر باہر سے سمجھتی ہو۔ تم ٹھوک بجا کر اُسی شخص کی طرف ہاتھ بڑھاؤ جو انسانی تعلقات کو سمجھتا ہو۔ انسانی زندگی کی قدر کرتا ہو؟ میگی کو پسند کرتا ہو؟''

اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ شوخ نظروں سے مجھ کو دیکھتی ہوئی احساس دلانے لگی کہ اُس نے اپنی منزل کو پالیا ہے۔ اُس کی تلاش اب ختم ہوئی اور اِدھر اُدھر بھٹکنا بھی تمام ہوا۔ لیکن میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اُٹھی کہ مَیں اپنے ہی تجویز کردہ راستے پر بھینٹ چڑھنے کو جا رہا ہوں۔ اُس کا نرم گرم ہاتھ میرے ہاتھ پر جم کر رہ گیا۔ پُر امید آواز میں بولی:

''مَیں دل سے تمھاری قدر کرتی ہوں۔ ہمیشہ تم کو پسند کیا ہے۔ پھر میگی تو تمھاری جان ہے.... کیا تم مجھ سے....؟''

اُس نے جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مگر وہ ازخود مکمل ہو کر مجھ تک پہنچ گیا تھا۔ کمرے کے در و دیوار مجھے ہلتے ہوئے دکھائی دیے۔ لرزاں ہاتھوں سے مَیں نے سگریٹ سلگایا اور تھوک نگل کر کہا:

''کوئی شک نہیں، مَیں میگی کو بہت چاہتا ہوں۔ تم کو بھی پسند کرتا ہوں.... مگر جہاں تک کسی کے ساتھ عمر گزارنے کا سوال ہے تو مَیں اُس حد تک...''

مَیں نے بھی جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مگر اس کا ردِعمل یہ ہوا کہ وہ اپنی عمر سے کئی برس بڑی دکھائی دینے لگی تھی۔

''پلیز مجھے غلط مت سمجھنا۔ اُس کے بہت سے کارن ہیں۔''

اُس کا گم صم ہو جانا ثبوت دے رہا تھا کہ مَیں نے اُس کی زندگی کی تمام خوشیاں چھین لی ہیں اور اب وہ بے یارو مددگار بیٹھی اس سوچ میں ہے کہ وہ اپنا جیون کس ڈھنگ سے سنوارے؟''

''بُرا مت ماننا، مَیں خود کو تمھاری دھرتی پر اجنبی سمجھتا ہوں۔ مجھے یہاں کا جیون بھی زیادہ راس نہیں آیا.... یہاں پیسے ضرور ہیں مگر بھید بھاؤ بہت زیادہ ہے۔ پورا معاشرہ لالچ، خود غرضی اور استحصال کی بنیاد پر کھڑا ہے.... میری کوشش شروع سے رہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیسا بنا کر یہاں سے چلا جاؤں۔''

''کہاں جاؤ گے؟''

''وہیں، جہاں مَیں نے شعور پایا تھا۔ جہاں میرے سب اپنے پرائے موجود ہیں۔''

''تمھارا مطلب ہے بامبے؟''

''ہاں وہاں ساگر کنارے ایک چھوٹی سی کاٹیج بنانے کا ارادہ ہے۔ جہاں مَیں اپنی رہی سہی زندگی لکھ پڑھ کر گزار سکوں۔''

''کاٹیج تو یہاں بھی بن سکتی ہے؟''

''ہاں، کیوں نہیں...لیکن مَیں اپنے کلچر اور اپنی تہذیب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا.... میرا دم گھٹتا ہے یہاں۔''

وہ میری اندرونی کیفیت سے زیادہ خوش نہ ہوئی تھی۔ اُس کی زخمی مسکراہٹ کہہ رہی تھی کہ مَیں نے اُس کے جیون کا ایک اور در بند کر ڈالا ہے۔ مجھے سخت افسوس ہوا۔ مگر مَیں مجبور تھا۔

میرے دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی تو مَیں سمجھ گیا کہ میگی چلی آئی ہے۔ مَیں بھی لباس تبدیل کر چکا تھا۔ میگی لِنن کا سیاہی مائل فراک پہنے بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ باربرا کو ریاست کی طرف سے اُس کی رہائش کے ساتھ جو ذاتی اور میگی کے واسطے مالی امداد ملا کرتی تھی اُس کا زیادہ تر حصہ وہ میگی کی بہترین خوراک اور اُس کے بہترین کپڑوں پر خرچ کر دیا کرتی تھی۔

سورج کئی دنوں کی غیر حاضری کے بعد اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ نمودار ہوا تھا۔ موسم گرما کے ابتدائی دنوں میں بے داغ نیلا آکاش آنکھوں کو بڑا بھلا لگ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف ایک ہی طرز کے تعمیر کردہ مکان کھڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ صبح کی تازہ ہوا دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی۔ میرا ذہن قدرے ہلکا ہو گیا تھا۔ ورنہ اُس جوان نے تو میری صبح ہی برباد کر ڈالی تھی اور مجھ کو ذہنی گرداب میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

''سنو میگی، تم اُس شخص کو جانتی ہو جو میرے ساتھ والے کمرے میں رہتا ہے؟''

''ہاں، اُس کا نام احمد ہے۔''

''باسٹرڈ۔'' زیرِ لب اُسے گالی دے کر مَیں نے میگی سے دریافت کیا:

''وہ کہاں کا رہنے والا ہے؟''

''ماں کو سب پتہ ہے۔''

ہائی اسٹریٹ کی دوکانیں شروع ہو چکی تھیں۔ اُچھلتی کودتی میگی میرا ہاتھ چھڑا کر ایک ایشیائی نژاد کی منی سپر مارکیٹ میں داخل ہو گئی۔

اگلی شام باربرا کے بلانے پر مدت کے بعد مَیں اُس کے کمرے میں گیا تھا۔ وہاں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی تھی، سوائے اس کے کہ میگی کی بڑھتی ہوئی عمر کی چند تصویریں وارڈ روب اور ڈریسنگ ٹیبل پر سجادی گئی تھیں۔ چائے کے مگ ہمارے درمیان دھرے تھے اور ہم سگریٹ کے کش لیتے ہوئے نپی تلی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی بے تکی سی بات موسم، مکان اور مسز روزن برگ کے متعلق کر لیا کرتے تھے، ورنہ خاموشی چھائی رہتی۔ لیکن مَیں جب سے اُس کے کمرے میں داخل ہوا تھا یہ خیال میری سوچ پر بھاری تھا کہ باربرا کو آج میری ضرورت کیوں کر محسوس ہوئی ہے؟ طرح طرح کے وسوسے اور خدشات سر اُٹھا رہے تھے۔ لہٰذا مَیں محتاط تھا کہ باربرا کا کوئی نیا منصوبہ یا تجویز مجھ کو اُس کی زندگی میں کہیں اُلجھا کر نہ رکھ دے۔ کچھ دیر میں وہ مجھ سے مخاطب ہوئی تو آواز اتنی دھیمی تھی کہ وہ مشکل سے میرے کانوں تک پہنچ پائی:

''کل صبح احمد تمھارے پاس آیا تھا؟''

احمد کا نام سن کر میں کرسی سے اُٹھتے اُٹھتے رہ گیا۔ لیکن میں نے خود کو قابو میں رکھا اور الفاظ کو دبا کر کہا:

''ہاں آیا تو تھا۔''

''میں نے ہی اُسے تمھارے پاس بھیجا تھا۔''

یکبارگی بار برا ایک پُراسرار عورت کی شکل اختیار کر بیٹھی تھی۔ میری سمجھ سے بالاتر تھا کہ اُس کا احمد کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ اور اُسے احمد سے کیا لینا دینا؟

''احمد کے ساتھ ٹریجڈی ہو گئی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ تم اُس کی مدد ضرور کرو گے۔ مگر وہ اتنا پریشان تھا، اتنا بوکھلایا ہوا تھا کہ تم سے اپنی پرابلم بھی بیان نہ کر پایا اور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر واپس چلا آیا....''

''اور میرے واسطے ایک معمہ بن کر رہ گیا۔''

میں نے اُس کا جملہ کاٹ کر گہری چوٹ کی۔

''تم کو ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اُس کی ماں مر گئی ہے۔''

''جانتا ہوں۔''

میرا لہجہ دھیما ضرور پڑ گیا تھا مگر تلخی کم ہونے میں نہ آئی:

''دیکھا جائے تو مسٹر احمد کے ساتھ میرا کیا تعلق ہے؟ پھر اُس کی ماں کے ساتھ بھی؟''

اُسے خاموش اور سنجیدہ پا کر میرا ذہن پھر سے سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ خیال آیا کہ وہ احمد کے واسطے وکالت کیوں کر رہی ہے؟ اور پھر عورت جب کسی کی وکالت کرتی یا اُس کا دم بھرتی ہے تو اُس کا ذاتی مفاد اور دلچسپی کہیں نہ کہیں نمایاں ہونے لگتی ہے۔ مگر یہاں نہ تو مجھے کوئی ایسی بات ظاہری سطح پر محسوس ہوئی اور نہ ہی اُس کی تہہ داری میں۔ مکمل حیرانگی سے میں اُس کو دیکھتا رہا۔

''احمد کی ماں کو کینسر تھا۔ وہ اُس کے علاج کی خاطر رقم برابر بھیجتا رہا اور خود ہمیشہ تنگی میں رہا.... مگر اُس کی ماں چل بسی۔ دو روز پہلے بنگلہ دیش سے فون آیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے آخری رسوم تو ادا نہیں

کر پائے گا۔ مگر اُسے ڈر ہے کہ اگر وہ دیر سے وہاں پہنچا تو اُس کے بھائی بند پوری جائیداد کے مالک بن بیٹھیں گے۔''

''لیکن مائی ڈیر باربرا اسمتھ، مَیں لندن میں رہتا ہوں۔ معاملہ بنگلہ دیش کا ہے... میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''احمد کے پاس جہاز کی ٹکٹ خریدنے کو پیسوں کی کمی ہو رہی تھی..... کچھ کا بندوبست میں نے کر دیا تھا، مگر پھر بھی رقم کم تھی۔ میرے ہی زور ڈالنے اور دباؤ پر وہ تمھارے پاس آیا تھا۔''

''اور اب؟'' بے ساختہ مَیں نے دریافت کیا۔

''وہ رقم مَیں نے اپنی گیارنٹی پر اُسے مسز روزن برگ سے دلوادی ہے..... آج شام میں اُس کی ڈھاکہ کی فلائیٹ ہے اور اس وقت وہ ایرپورٹ پر ہوگا۔''

''گڈ''

کہہ کر مَیں نے ایک دو بار تالی بجائی اور قدرے اُکھڑ کر کہا:

''باربرا تم بڑی سادہ لوح ہو۔ پہلے بھی دھوکا کھا چکی ہو... مگر آج تک سنبھل نہیں پائیں..... بھلا مَیں احمد کو قرض کیوں کر دیتا، جسے مَیں سرے سے جانتا ہی نہیں؟''

''تم رائیٹر ہو۔ دردمند دل رکھتے ہو۔ لوگوں کے دُکھ درد میں شریک ہوتے ہو۔''

''ہاں مَیں ایسا ہوں۔ یہ میری فطرت ہے..... مگر کون دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ احمد بنگلہ دیش سے لوٹ کر آئے گا یا نہیں؟''

''ایسا مت کہو۔ وہ ضرور آئے گا۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''مَیں احمد کو بہت قریب سے جاننے لگی ہوں۔ وہ انتہائی مخلص، ایماندار اور صاف گو آدمی ہے۔''

''یہ اُس کا فریب بھی تو ہو سکتا ہے۔''

''ایسا مت کہو... مَیں احمد کو اندر باہر سے جان چکی ہوں۔''

''مطلب؟''

''وہ مجھ سے شادی کرنے جا رہا ہے۔''
لڑھکتی ہوئی چٹان میرے سر پر آن گری۔ مگر خود کو سنبھال کر مَیں نے سوچا کہ دونوں کی شخصیات میں کتنا فرق ہے؟ باربرا دودھ میں نہائی ہوئی سفید حسین عورت ہے، جب کہ احمد قبول صورت سانولا سلونا شخص؟ ذہنی اعتبار سے بھی شاید ہی ایک سا تال میل رکھتے ہوں؟ لیکن میں باربرا کی پرابلم کو خوب سمجھتا تھا، اُٹھ کر مَیں نے اُس کا گال چوم لیا۔ پھر اُس کی آنکھوں میں اُتر گیا:
''مبارک ہو۔ مَیں دل سے خوش ہوں۔ احمد تم سے شادی کر رہا ہے... مگر تم سے ایک بات پوچھنا چاہوں گا؟ بالکل ذاتی.... جواب دو گی؟''
''کیوں نہیں، کہو۔''
''کیا تم واقعی احمد کو دل سے پسند کرنے لگی ہو؟''
عجیب سی اداسی اُس کی آنکھوں میں اُبھر آئی تھی۔ مجھ سے آنکھیں چرا کر اُس نے گہرا سانس بھرا۔ کھڑکی سے باہر کہیں دور دیکھا اور کچھ سوچ کر افسوس سے کہا:
''میگی کے جنم لینے پر میرے لیے پسند ناپسند اور چاہت کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ اُن کو کھولتے کھولتے مَیں تھک چکی ہوں.... پھر زندگی میں کچھ پانے کو کچھ کھونا بھی تو پڑتا ہے ناں!''
اُس کے چہرے پر مفاہمت ہی مفاہمت تحریر تھی۔

☆☆

بولتا بدن

ایک عزیز دوست انڈیا جا رہا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا کہ دسویں روز وہاں اُس کی شادی قرار پائی تھی۔ ہم ہیتھرو ہوائی اڈے پر پہنچ چکے تھے۔ ٹرمنل پر ہر قوم، رنگ، نسل اور شہریت کے لوگ ہر سو دِکھ رہے تھے۔ بہت بڑا ہال تھا۔ روشنیوں سے جگمگاتا ہوا۔ ہر طرف مختلف ایرلائنز کے کاؤنٹر تھے۔ جہاں مسافر اپنا اپنا سامان ٹرالی میں ڈالے قطار لگائے کھڑے تھے۔ میرا دوست اپنا سامان چیک اِن کروا کر فارغ ہوا تو ہم بغلگیر ہوئے۔ اپنائیت سے مسکرائے۔ دل قدرے بھاری ہوئے، آنکھیں نم ہوئیں۔ پھر مَیں اُسے ''گڈ لک اور رب راکھا'' کہہ کر لفٹ کی طرف بڑھ گیا، جس کی بدولت مجھے کار پارک تک پہنچنا تھا۔

لفٹ کا دروازہ کھلا تو پیگی دیگر مسافروں کے ساتھ نکلتی ہوئی دکھائی دی۔ اُس کے ہمراہ مناسب قد، مگر تیکھے نین نقش اور سنہری بالوں والا کوئی رومن شہزادہ بھی تھا۔ اُس نے سامان سے بھری ٹرالی تھام رکھی تھی۔ مَیں پیگی کو وہاں دیکھ کر سخت حیران ہوا۔ دل نے چاہا کہ تیزی سے لفٹ میں داخل ہو کر یہ تاثر دوں کہ مَیں نے اُسے دیکھا ہی نہیں، مگر یہ ممکن نہ رہا تھا کہ پیگی سے نظریں

ٹکرا چکی تھیں۔ چہروں کے تأثرات بھی بدل چکے تھے۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی، مَیں ہی پوچھ بیٹھا:

''کہاں جا رہی ہو؟''

''مالٹا۔''

''سنا ہے بڑی رومانٹک جگہ ہے؟''

''یہ تو دیکھنے پر ہی پتہ چلے گا۔''

پھر اُس نے اپنے ساتھی کو گہری نظروں سے دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہوئی:

''یہ ٹام ہے.... میری زندگی.... میری دُنیا.... میرا سب کچھ۔''

ٹام نے جھک کر اپنے ہونٹ اُس کے جنس زدہ ہونٹوں پر رکھ دیے۔

''اور یہ ہے میرا انڈین فرینڈ پرکاش.... جو ہمیشہ میرے کام آیا ہے.... اس سے مل کر ایمگرانٹز (IMMIGRANTS) کے بارے میں میری رائے بدل گئی ہے۔ اب تو میں چاہوں گی کوئی انھیں یہاں سے نہ نکالے۔''

ہم دونوں ہنس دیے لیکن ٹام کے ہونٹ ساکت رہے۔ بلکہ اُس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے وقت میری آنکھوں میں جھانک کر جاننا چاہا کہ پیگی کے ساتھ میرے تعلقات کس نوعیت کے تھے؟ محض دوستی کی حد تک یا اُس سے کہیں آگے؟ مَیں نے فوراً ہی ایک مشاق اداکار کی طرح اصلی چہرے پر نقلی چہرہ چڑھا لیا تھا اور لاتعلقی سے پیگی کو دیکھتا رہا۔ ٹام کا مقصد فوت ہوا تو وہ جیب سے سفری ٹکٹ نکال کر اور ''ایکسکیوزمی'' کہہ کر کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔ پیگی نے اشتیاق، تجسس اور فخر سے مجھ کو دیکھا۔

''ٹام کے بارے میں کیا خیال ہے تمھارا؟''

''تمھاری پسند کی داد دیتا ہوں۔ وہ مجھ سے زیادہ جوان، خوبصورت اور پُرکشش ہے.... لیکن...؟''

اچانک میری آواز میں سنجیدہ پن اُبھر آیا اور بلا سوچے سمجھے میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا:

''سنو پیگی!.. اگر اس بار بھی ڈور کسی کارن ہاتھ سے چھوٹ جائے تو فکر مت کرنا۔ مَیں ابھی زندہ

ہوں۔''

وہ مکمل حیرت زدہ، ناقابلِ اعتبار نظروں سے مجھ کو دیکھنے لگی۔ اُسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میرا کہا سچائی کا کوئی پہلو اپنے ساتھ لیے ہوئے تھا۔ مگر اُس نے مجھے سنجیدہ پایا تو اُس کے چہرے پر تازگی کی لہر دوڑ گئی۔ مَیں چونکا، قدرے گھبرایا، پھر خوف میرے اندر سر اُٹھانے لگا۔ مَیں نے خود کو سنبھالا اور اُسے گڈ لک کہہ کر لفٹ میں داخل ہو گیا۔ مگر اُس سے الگ ہوتے ہی یہ احساس میری تکا بوٹی کرنے لگا کہ مَیں نے اُسے اپنی زندگی میں پھر سے شامل ہونے کی دعوت کیوں دے ڈالی؟ بار بار دلدل سے بچ نکلنا ممکن نہیں ہوا کرتا۔ ہمارے تعلقات تو کب کے ختم ہو چکے تھے۔ مَیں نے آج اُسے ایک لمبے عرصے کے بعد دیکھا تھا۔ اس دوران میری ذہنی پریشانی تو کب کی ختم ہو چکی تھی کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ اور اپنی شامیں کس کے ساتھ بسر کر رہی ہے۔ لیکن کسی اجنبی کی صحبت میں اُسے دیکھ کر جانے میری عقل کہاں چرنے چلی گئی تھی؟ مَیں نے جانے کیوں اپنے جیون کے بند کواڑ پھر سے کھول ڈالے تھے۔ مَیں غصے میں بھنّایا ہوا سوچ رہا تھا کہ لب سڑک ہرا کری (جاپانی خودکشی) کرلوں یا اپنی بھاگتی دوڑتی کار کو کسی دوسری کار سے ٹکرا کر خود کو ختم کرلوں۔ لیکن مَیں ایسا کچھ بھی نہ کر پایا۔ بلکہ موٹروے پر اپنی کار کی رفتار کو کم کر کے بائیں ہاتھ کی سلو لین میں چلا آیا۔ میرا مخدوش ذہن اپنے آپ پیچھے کی طرف دوڑنے لگا۔ کسی غیبی طاقت نے میری کار کی رفتار مزید کم کر ڈالی۔ وہ شام رہ رہ کر میرے ذہن کے پردے پر اُبھرنے لگی جب مَیں اپنے چند دوستوں کے ساتھ جو میری ہی طرح انڈیا سے بہتر زندگی کی تلاش میں لندن میں آن بسے تھے اور میری ہی طرح جوان اور مجرد تھے۔ بانڈ اسٹریٹ کے ایک نائٹ کلب میں موجود اُس کی رونق بڑھا رہے تھے۔ کلب کا ہر گوشہ جوان لڑکے لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ڈانسنگ فلور پر جوان جسم موسیقی کی تیز لے پر ناچ رہے تھے۔ روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ چند جوڑے کھمبوں کا سہارا لیے محوِ بوس و کنار تھے اور چند شب باشی کی خاطر پر تول رہے تھے۔ اس ماحول میں پہنچ کر مجھے ایک ہی خیال آیا کرتا تھا کہ یہ تفریحی ادارے اخلاقیات کے دائرے سے بالکل آزاد ہیں۔ لیکن ساتھ میں اخلاقیات کے معنی اور اُس کی اہمیت کو سمجھنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ بار کاؤنٹر

پر کئی لڑکے لڑکیاں کھڑے، ڈرنک خریدنے کی خاطر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ وہاں ایک پُرکشش لڑکی سے میری نظریں ٹکرائیں تو وہ وہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ وجدان ہوا کہ ہو نہ ہو آج میں اس حسینہ کی خاطر یہاں وارد ہوا ہوں۔ ہم نے بیئر کے گلاس تھامے اور اپنے اپنے گروپ کی طرف چل دیے، لیکن کچھ دیر بعد اُس لڑکی کا نرم گرم ہاتھ میرے مضبوط ہاتھوں میں تھا اور ہم ڈانسنگ فلور پر دیوانہ وار ناچتے ہوئے ایک دوسرے کی خارجی شخصیت کا جائزہ بھی لیے جا رہے تھے۔ وہ سروقد، ڈینم کے چست لباس میں ملبوس تھی۔ بدن کا نچلا حصہ زیادہ ہی کسا ہوا تھا، جو میرے باطن میں ہلچل مچانے کو کافی تھا۔ اُس کے گول چہرے پر پھیلی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں ہر بار میرے کسرتی بدن سے ہو کر میرے سینے کے بالوں پر آ کر ٹھہر جاتیں۔ وہ بلوری آنکھیں مقناطیسی کشش رکھتی تھیں۔ پل پل ہماری پسند، ہمارے دل اور دماغ اپنی اپنی زبان بول رہے تھے۔ میرے یار دوست رشک سے مجھ کو دیکھ رہے تھے کہ میں نے آتے ہی رات کا پنچھی پھانس لیا ہے۔ جب کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ ماہر ٹھہرے تھے۔

دیر تک میں اور پیگی پینے پلانے کے ساتھ ساتھ موقع بہ موقع ناچتے بھی رہے۔ ہماری آنکھوں میں آزاد دُنیا کے نئے نئے خواب جاگ رہے تھے اور ہم اُن کو عملی شکل دینے کی سوچ رہے تھے۔ پھر وقت نے اپنے پر پھیلا دیے تو کلب میں موجود ہر شخص کو اُس کی اہمیت کا احساس ہوا۔ جلد ہی پیگی میرے برابر ٹیکسی میں بیٹھی میری رہائش گاہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔

میں نے دھیرے سے مکان کا عقبی دروازہ کھولا اور چپکے سے پیگی کا ہاتھ تھامے، دبے پانو اپنی منزل پر پہنچ کر اپنے فلیٹ نما کمرے میں داخل ہو گیا تا کہ میرے ایشیائی مالک مکان اور اُس کے خاندان کے دیگر افراد کے اخلاقی اصولوں میں دراڑیں نہ پڑ جائیں۔

رات گئے تک ہمارے جوان بدن ایک دوسرے کو کھنگالتے رہے۔ ہر حصے کی واقفیت ہر حصے سے ہوتی چلی گئی۔ میرا گٹھا ہوا بدن جو اپنے دیس میں ہاکی کا معروف کھلاڑی ہونے کے کارن اور پردیس میں بھاری کام کرنے کے کارن جاذب نظر بن چکا تھا، پیگی کو کچھ زیادہ ہی بھا گیا تھا۔ اکثر لڑکیاں مجھ سے کہا کرتیں کہ میں بدنی کھیل کے دوران چاہے بولوں یا نہ بولوں

لیکن میرے بدن کا انگ انگ اپنی زبان خود بولا کرتا ہے۔ یہی حال پیگی کا بھی تھا۔ اُس کے نازک ہاتھ میرے بدن پر پھیل کر اُسے لگاتار سہلاتے رہے۔ کبھی اُس کے جنس زدہ ہونٹ اُسے چوم بھی لیتے اور کبھی اُس کا کوئی حصہ دانتوں کی زد میں آجاتا تو میں تڑپ اُٹھتا۔ لیکن چیخنے چلانے کی بجائے درد پی جاتا کہ کہیں میری آواز مالک مکان کے کمرے تک نہ جا پہنچے۔ مجھے پیگی کی حرکات سے بڑا آنندمل رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ وہ اسی ڈھنگ سے میرے بدن کے پٹھوں اور بازوؤں کی مچھلیوں کو چومتی چاٹتی اور کاٹتی رہے اور رات کبھی ختم نہ ہو۔

صبح کافی دیر سے آنکھ کھلی تو کائنات روشن تھی، مگر پیگی چھپکلی کی طرح مجھ سے چپکی ہوئی تھی۔ اُس کا آسودہ اور پُرسکون چہرہ رات کی داستان بیان کرر ہا تھا کہ وہ اپنے نئے تجربے اور ایڈونچر سے صرف مطمئن ہی نہیں رہی بلکہ اُس کے بدن کا ہر انگ، ہر مسام مدتوں بعد سرشار ہوا ہے۔

موسم بدل گیا تھا، لیکن پیگی کے ساتھ یہ سلسلہ کم وبیش مستقل شکل اختیار کر بیٹھا تھا۔ وہ کئی شامیں میرے ساتھ گزارنے لگی تھی۔ مالک مکان کے ساتھ میرا ایک معاہدہ ہو گیا تھا جو اپنی ہی نوعیت کا تھا۔ جس رات میری میری گرل فرینڈ میرے کمرے میں قیام کرے گی، مجھے الگ سے رقم ادا کرنی ہوگی۔ رقم طے ہونے پر اُس نے ایک دوسری شرط بھی عائد کی تھی کہ ہم ہمیشہ مکان کے پچھلے دروازے سے آیا جایا کریں گے۔ تاکہ اُس کی اسکول جاتی بچیاں بُرا اثر قبول نہ کریں۔ مَیں نے اُس کی یہ شرط بھی مان لی تھی کہ مجھ کو پیگی سے اُنس ہو چلا تھا جو روز بروز بڑھ رہا تھا۔ وہ یونیورسٹی کی ڈگری یافتہ تھی۔ بیدار مغز، روشن خیال اور دُنیاوی امور سے خوب خوب واقف۔ ابتدا میں اُس کے ساتھ ایک دو شامیں بسر کرنے پر مَیں اس خیال میں تھا کہ وہ بھی اُن جوان لڑکیوں میں سے ہوگی جو گزرتے بادل کی طرح برس کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ ون نائٹ اسٹینڈ (ONE NIGHT STAND) یا نئے ایڈونچر یا فری سیف سیکس کی خاطر کسی بھی اجنبی کے ساتھ رات بسر کرنا معیوب نہیں سمجھتیں۔ مگر دوبارہ اُس شخص سے ملنا بھی پسند نہیں کرتیں۔ اگر اتفاق سے ملاقات ہو بھی جائے تو اُس کے ساتھ ایک اجنبی کی طرح پیش آتی ہیں۔ لیکن پیگی شاید الگ الگ

مقام پر برس کر تھک چکی تھی۔ وہ ایک ہی مقام پر تھم کر برسنا چاہتی تھی۔ یہ احساس مجھے اُس شام کو ہوا جب ہم ساؤتھ بینک پر دریائے تھیمز کے کنارے چہل قدمی کر رہے تھے۔ اُجلی شام تھی۔ سورج ڈھلنے کی فکر میں تھا۔ ہم ایک بینچ کے قریب سے گزرے تو پیگی بینچ پر بیٹھے ہوئے جوان کو پلٹ پلٹ کر دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے اچنبھا ہوا کہ وہ گزرے ایام میں کیا تلاش کر رہی ہے؟ لیکن اُس کا عمل جاری رہا۔ اُس کے چہرے کے تاثرات بھی بدل رہے تھے۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا۔ دریافت کیا:

''کیا تم اُس نوجوان کو جانتی ہو؟''

''یقین سے نہیں کہہ سکتی۔''

''مگر جس ڈھنگ سے تم اُس کو دیکھ رہی ہو، تمھارا اُس کا سمبندھ ضرور رہا ہے۔''

اُسکا چہرہ بے معنی مسکراہٹ سے اتنا بھر گیا تھا کہ وہ چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے مجھ کو تکتی رہی پھر اُس نے مجھے احساس دلانا چاہا کہ مَیں یہاں کے آزاد معاشرے اور طرزِ زندگی کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں رکھتا۔۔۔ لہجہ بدل کر گویا ہوئی:

''یہاں کسی لڑکی سے اُس کی بیتی ہوئی زندگی کے بارے میں نہیں پوچھا کرتے ....اگر تم اُس کے PAST کو جاننا چاہتے ہو تو اُس کی ڈائریاں پڑھو....جس میں ہر نیا جنسی تجربہ یا ون نائٹ اسٹینڈ کا ذکر ہوتا ہے۔''

یہ سننا تھا کہ اُس کی کمر کے گرد پھیلے ہوئے میرے بازو نے اتنی تیز حرکت کی کہ وہ میرے سینے سے آن لگی۔ ہونٹ چھو کر مَیں اُس کی آنکھوں میں اُتر گیا:

''بُرا مت ماننا....تم نے آج تک اپنی کسی ڈائری کا ذکر نہیں کیا؟''

''ہاں یہ سچ ہے.....مَیں ڈائری بہت پابندی سے لکھا کرتی تھی، مگر ایک وقت ایسا بھی آیا، مَیں لکھتے لکھتے اُکتا گئی اور مَیں نے ڈائری لکھنا بند کر دی۔''

''کیوں؟ کوئی خاص وجہ تھی؟''

''ہاں، تم جو مل گئے تھے۔''

میرے ہاتھ آکاش کی طرف اُٹھ گئے۔ مَیں بے پناہ خوش تھا کہ وہ ایک ہی مقام پر ٹھہر کر اور کھل کر برسنا چاہتی ہے۔ وہ برابر برستی رہی اور مَیں برابر بھیگتا رہا، وہ بھی ہڈیوں تلک، اور سے اپنی گتی چلتا رہا۔ مگر یہ احساس بھی میرے ساتھ ساتھ میرے اندرون تک رہا کہ وہ ہر اعتبار سے مجھ پر موقوف ہوتی جارہی ہے۔ مَیں اپنے لیے کم، اُس کے واسطے زیادہ زندہ ہوں۔ ہمہ وقت اُس کے لیے میرے دل، جیب اور گھر کے دروازے کھلے رہتے۔ وہ کسی بھی در پر دستک دینے سے ذرا بھی نہ چوکتی۔ ایک دو شامیں میرے ساتھ گزارنا اُس کا معمول بن چکا تھا۔ مگر اگلی صبح وہ اپنی ملازمت سے اکثر غیر حاضر رہا کرتی۔ بلکہ مجھے بھی مجبور کرتی کہ مَیں اُس روز کام کو گول کر جاؤں۔ اُس کا کہنا تھا کہ آدمی کو اُتنا ہی کام کرنا چاہیے جس سے اُس کی بنیادی ضروریات پوری ہو جائیں۔ اُسے اڑوس پڑوس یا ریاست کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑے۔ لوگ باگ پاگل ہیں کہ صبح اُٹھتے ہی پیسے کی ہوس میں بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن ایک مَیں تھا کہ پردیس میں پاؤں جما لینے پر روزانہ کام پر حاضر ہونا میرا ایمان بن چکا تھا۔ ایک شام وہ میرے ٹھکانے پر ہی تھی کہ مَیں نے اُسے سمجھانا چاہا:

''پیگی مائی ڈارلنگ، ہر ہفتے تم کام سے ایک یا دو دن غائب رہتی ہو .... پے پیکٹ (PAY PACKET) کا کونا بھی کٹ جاتا ہے۔ کتنا نقصان ہوتا ہے تمھارا؟''

''تو کیا ہوا.... میری ہر ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ جب زیادہ پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے، مَیں پورا ہفتہ کام کرتی ہوں۔''

''مگر تم کو اپنے RAINY DAYS کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔۔ کچھ بچاؤ گی تو وہ پیسہ مصیبت اور مشکل وقت میں کام آئے گا۔''

''بلیڈی کالونیل تھینکنگ۔''

وہ الفاظ کو چبا کر اُٹھ بیٹھی۔ میز پر وہسکی کی بوتل رکھی تھی وہاں کچھ ریزگاری بھی پھیلی ہوئی تھی۔ اُس نے گلاس تیار کیے اور ریزگاری میں سے ایک پونڈ کا سکہ اُٹھا کر مجھے دِکھایا اور بولی:

''اِس کے بغیر اس دُنیا میں جینا مشکل ہے۔ مگر شادی کرنے پر میرا ہسبنڈ میرے ساتھ میرے

بچوں کی پرواہ بھی خود کرے گا۔ مَیں کیوں کروں؟''
''اور اگر اُس نے کسی کارن تم کو چھوڑ دیا تو....؟''
''کوئی فرق نہیں پڑے گا مجھ کو.... مَیں کوئی دوسرا شخص ڈھونڈ لوں گی۔ اپنی پسند کا....اور جب تک وہ نہیں ملے گا، میری اور میرے بچوں کی ذمہ داری اسٹیٹ (ریاست) کی ہوگی۔''
مغربی تہذیب کی آزاد عورت اور اُس کی جیتی جاگتی تصویر میرے سامنے براجمان تھی۔ لیکن میرا ذہن تو مشرقی لڑکیوں اور اُن کے رویوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔

پیگی جس رفتار سے میری شخصیت کا حصہ بن چکی تھی اور مَیں بھی اپنا تن من اور دھن اُس پر نچھاور کرنے کو تیار تھا۔ اکثر سوچا کرتا کہ اس افیر (Affair) کا انجام کیا ہوگا؟ میرا اُٹھنا بیٹھنا، گھومنا پھرنا پیگی کے دوستوں کے ساتھ ہی رہا کرتا تھا۔ انھوں نے مجھے دل سے قبول کرلیا تھا کہ جوان طبقہ نسلی بھید بھاؤ سے قریب قریب پاک تھا۔ دُنیا تیزی سے بدل رہی تھی۔ ویت نام جنگ میں امریکہ کی شکستِ فاش، امپیریل ازم کی جڑوں کا کہیں ہلنا، کہیں اُکھڑنا۔ غلام ملکوں کا یورپی آبادکاروں کے استبداد سے آزاد ہونا۔ یورپین عورتوں کا مساوی حقوق پانے کی خاطر تحریکِ نسواں کا اس قدر زور پکڑنا کہ جوان طبقے کا سڑکوں پر نکل کر احتجاج کرنا۔ ان سب حقائق نے جوان نسل کی سوچ ہی بدل ڈالی تھی۔ وہ آزاد خیالی کی دلدادہ بلا کسی وکٹورین قدر، پابندی، بندش اور قدغن کے جینا چاہتی تھی اور وہی اُن کی طرز زندگی بن کر رہ گئی تھی۔ مگر پیگی اور اُس کے دوست احباب تو کب کے زمانے کی رفتار سے آگے نکل چکے تھے۔ مَیں اُن کی قربت میں برطانوی معاشرے کی روایات، تضادات، طبقاتی تفریق اور نوآبادیاتی تاریخ کو سمجھ کر اپنا ذہن بناتا رہا۔ لیکن دوسری طرف مَیں اپنے دیرینہ دوستوں سے کٹتا بھی چلا گیا جس کا مجھے افسوس بھی تھا اور دُکھ بھی۔. انھوں نے ضرور سوچا ہوگا کہ مَیں بے گانوں میں گھر کر اپنوں کو بھلا بیٹھا ہوں اور اب سفید چمڑی کا خوشہ بردار بنا اُن کے تلوے چاٹ رہا ہوں۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ درحقیقت مَیں پیگی کے ساتھ اتنا دور تک نکل گیا تھا کہ میری دُنیا حسین اور رنگین بن چکی تھی۔ واپس لوٹنا اب میرے واسطے مشکل تھا۔

لیکن پیگی کے ساتھ ایک ہی ڈگر پر چلتے ہوئے بھی یہ احساس ضرور رہا کرتا کہ ہم ایک دوسرے کو جی جان سے چاہتے تو بہت ہیں مگر ہماری منزل ایک نہیں ہے۔ یہ سوالیہ نشان اتنا گہرا اور نمایاں تھا کہ میرا اندرون اُسے نصف بہتر تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ بلکہ میں اس تصور سے ہی کانپ اُٹھا کرتا تھا کہ میں اپنا پورا جیون اُس کے لیے تج دوں؟ چند بنیادی نکات میری سمجھ میں آچکے تھے۔ ملی جلی شادی میں تہذیبی تصادم تو ہوا ہی کرتا ہے کہ یہ فطری امر قرار دیا گیا ہے۔ لیکن میاں بیوی کے نزدیک اپنا اپنا کلچر، زبان، تہذیب، خورد ونوش اور مذہب نہایت اہم جگہ پاتے ہیں۔ پھر اولاد کس کلچر اور مذہب کے سہارے پروان چڑھے گی؟ مسئلہ سنگین تھا۔ میں جتنا سوچتا اُتنا ہی اُلجھ جاتا۔ لہٰذا میں نے سوچنا بند کر دیا تھا۔ پیگی میرے بدلتے ہوئے رویوں کو دیکھ کر مسکرا دیتی۔ مگر اُس کی ہر چھوٹی بڑی مسکراہٹ اپنے ساتھ کئی معنی، کئی جہتیں لیے ہوتی، جن کو سمجھنا واقعی میرے واسطے مشکل تھا۔ ایک شام اُس نے ایک ایسی تجویز پیش کی کہ اُسے سن کر میرا دماغ چکرا گیا۔

''میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہوں، اپنا سامان اُٹھا کر تمھارے پاس رہنے کو چلی آؤں .... پھر ہر صبح، دوپہر، شام اور رات تمھارے ساتھ گزاروں.... کیا خیال ہے تمھارا؟''

میرا لہو خشک ہو گیا تھا۔ میں ہکا بکا، بوکھلایا ہوا اس سوچ میں گم ہو گیا کہ اگر ایسا ہو گیا تو وہ اگلے روز ہی اپنی ملازمت چھوڑ بیٹھے گی اور میرے گلے میں سفید ہاتھی لٹک کر میری ریڑھ کی ہڈی بھی صاف کر ڈالے گا اور بینک کا اُدھار بڑھتا ہی رہے گا۔ محتاط ہو کر میں نے چالاکی سے کام لیا:

''اس مکان کا مالک میں نہیں کوئی اور ہے.... بدقسمتی سے وہ انتہائی مذہبی آدمی ہے.... اور تم کو زیادہ پسند بھی نہیں کرتا.... تم یہاں آئیں تو وہ ہنگامہ کھڑا کر ڈالے گا اور ہم دونوں سڑک پر ہوں گے۔''

لیکن میری باتوں نے اُس پر کوئی اثر نہ چھوڑا۔ وہ تُلی تُلی نظروں سے مجھ کو دیکھتی رہی۔ پھر یکبارگی قہقہہ لگا کر زور سے ہنس پڑی اور مجھے یہ تأثر دینے لگی کہ میں کوئی پیدائشی بونا ہوں اور دُنیا سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ بولی:

"YOU ARE NOTHING, BUT A CHICKEN" (تم ایک مرغ کے سوا کچھ بھی نہیں ہو)

مَیں گلے میں طوق پڑنے سے ضرور بچ گیا تھا، مگر یہ ذلت میرے لیے برداشت سے باہر تھی۔
لیکن چپ سادھنے میں ہی دانشمندی تھی اور عافیت بھی۔

میری حالت اُس پرندے کی طرح ہو چکی تھی جو رہائی کی خاطر پنجرے میں پھڑ پھڑاتا ہو، مگر موقع ملنے پر اُڑنے سے اس واسطے ڈرتا ہو کہ دوبارہ اُسے اس معیار کا دانہ پانی نصیب ہو گا یا نہیں؟ میری سائیکی میں یہ ڈر بھی بیٹھ چکا تھا کہ پیگی کا اگلا قدم شادی کے متعلق ہو گا، جسے میں خوبصورت الفاظ کا سہارا لے کر ٹال تو سکتا ہوں مگر انکار کرنے کی جرأت نہیں رکھتا اور واقعی یہی ہوا۔ ایک ڈھلتی شام میں ہم لیسٹر اسکوائر کے اوڈین سنیما سے فلم ''الزبیتھ فرسٹ'' دیکھ کر نکلے تھے۔ فلم کمال کی تھی۔ پیگی پر اس کا اثر زیادہ تھا کہ وہ یونیورسٹی میں تاریخ کی طالب علم رہ چکی تھی۔
ہم ڈنر کے واسطے ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔ کشادہ ہال گاہکوں سے قریب قریب بھرا ہوا تھا۔ باہر اندھیرا اُتر کر کافی گہرا ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی زندگی ہر سو تھرک رہی تھی۔ رنگ برنگی روشنیاں۔ جلتے بجھتے نیون سائن، مسکراتے چہرے، مقامی لوگ، بھانت بھانت کے سیاح، حسین جوڑے اور اُن کی آمد و رفت، شاید اسی منظر کو دیکھ کر کسی نے کہا تھا کہ "LONDON NEVER SLEEPS" مَیں دلکش ماحول میں کھویا ہوا تھا کہ پیگی نے میری آنکھوں میں جھانک کر کچھ ٹٹولنا شروع کر دیا، جیسے وہ میری زندگی کے چند نئے پہلو جاننے کی خواہش مند ہو۔ تحقیقی لہجے میں بولی:
''شادی کب کر رہے ہو؟''
غیر متوقع سوال ایک صدمے سے کم نہ تھا۔ سنی اَن سنی کر کے مَیں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ پھر خود کو تیار کیا:
''اِس بارے میں کبھی غور ہی نہیں کیا۔''
''شاید تم اس خیال میں ہو کہ مَیں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں؟''
آنکھ ملائے بنا ہی مَیں گلاسوں میں وائن اُنڈیلتا رہا۔ مگر اُس نے اپنی بات کو جاری رکھا:
''مگر ایسا مَیں نے کبھی نہیں سوچا....اور نہ ہی سوچ سکتی ہوں۔''
وائن اُنڈیلتے ہوئے میرے ہاتھ وہیں رُک گئے۔ اُس نے بوتل میرے ہاتھ سے لے کر اُسے میز

پر رکھا اور صدقِ دل سے کہا:

''ہاں یہ سچ ہے۔''

مَیں بوکھلایا ہوا من ہی من میں خوش بھی ہوا جا رہا تھا کہ اب راستہ بالکل صاف ہے اور مَیں طویل مدت کے بعد کھلی فضا میں سانس لے پاؤں گا۔ لیکن میرا ذہن یہ قبول کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا کہ پیگی کے کہنے میں کوئی صداقت بھی تھی؟ وہ گزشتہ ڈھائی برسوں سے میرے گرد مضبوط زنجیر بنی لپٹی ہوئی تھی۔ کیوں؟ کس لیے؟ ممکن ہے یہ اُس کی کوئی نئی چال ہو؟ کوئی نیا کھیل ہو؟ اور صداقت وہی ہو جو اکثر مَیں سوچا کرتا تھا۔ رہائی پاتے ہوئے بھی میرے مَیں کو سخت تکلیف ہو رہی تھی۔

اُس نے میرے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھے تو سنجیدگی سے گوش گزار ہوئی:

''بہت پہلے تم سے ایک بات کہنا چاہتی تھی.... مگر اُن دنوں تم کافی جذباتی ہوا کرتے تھے.... اب تمھاری سوجھ بوجھ میں گہرائی پیدا ہو چکی ہے.... ہر شے کو صحیح روشنی میں دیکھ سکتے ہو، پرکھ سکتے ہو۔''

''تم وہ کہو جو کہنا چاہتی ہو.... گھما پھرا کر بات مت کرو۔''

''مَیں نے ہمیشہ تم کو پسند کیا ہے.... مگر کبھی اپنی اندر کی ذات سے یا یوں کہہ لو کہ اپنے رئیل سیلف (REAL SELF) سے تم کو پیار نہیں کیا۔''

یہ بول کسی میزائل سے کم نہ تھے۔

''ہاں یہ سچ ہے۔ مَیں تم سے زیادہ تمھارے بدن کو پسند کرتی رہی ہوں.... وہ میری ضرورت تھی اور ہے.... یقین کرو مَیں ہر رات تمھارا بدن ساتھ لیے سویا کرتی ہوں۔''

مَیں فنا ہو گیا، مگر میرے دل کا تقاضا کچھ اور ہی تھا کہ مَیں بھرے ریسٹورنٹ میں اُس کی پٹائی دل کھول کر کروں..... دُنیا بھر کی گالیاں دوں اور اتنا پیٹوں کہ وہ لہولہان ہو جائے۔ مگر مَیں بپھرا ہوا بس اتنا ہی کہہ پایا:

''تو آج تک تم مجھ کو استعمال کرتی رہی ہو؟''

''بالکل اُسی طرح جیسے تم مجھ کو استعمال کرتے رہے ہو.... فرق صرف اتنا ہے کہ میری ضرورت تمھارا بدن رہا ہے.... اور تمھاری ضرورت مَیں مکمل ہوں۔''

مَیں فوراً کھڑا ہوگیا کہ اپنے سخت ہاتھوں سے پیگی کی بھرے ریسٹورنٹ میں مرمت کردوں مگر عین اُسی وقت میرا اندرون بول اُٹھا کہ پیگی کی ہر بات میں سچ کے علاوہ کوئی دوسرا عُنصر شامل نہیں ہے۔ وہ روزِ اول سے مخلص اور پُر خلوص رہی ہے۔ اُس نے آج تک اپنی محبت کا اظہار کبھی براہِ راست یا دبے دبے لفظوں میں بھی نہیں کیا۔ وہ تو ہمیشہ تمھارے بدن کی دیوانی رہی ہے اور وہی اُس کی منزل ٹھہری تھی اور ہے۔ تم نے اُسے غلط سمجھا ہے۔ لیکن میری اَنا، میری دیوانگی، میرا دماغ کچھ بھی ماننے کو تیار نہ تھا۔ مَیں چیخ اُٹھا:

''شاید تم سوچتی ہو کہ مَیں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ تمھاری بھول ہے.... غور سے سنو پیگی۔ اب تمھیں اپنی ضرورت کے واسطے کوئی دوسرا آدمی تلاش کرنا ہوگا.... آج کے بعد مَیں تمھاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہوں گا۔''

مگر اُس نے میری طرح اپنے اعصاب نہ کھوئے تھے۔ مہذب طریقے سے مجھے سمجھانا چاہا:

''تمھارا غصہ تمھاری سوچ پر بھاری ہوا جا رہا ہے.... تم سچائی کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہو.... سمجھنے کی کوشش کرو پر کاش..... ہمیں ضرورت ہے ایک دوسرے کی.... بہتر ہوگا کہ ہم کوئی نئی جگہ لے کر صاف ستھرے ماحول میں باہمی سوچ سمجھ کے ساتھ اکٹھے رہیں۔''

''اور جب تمھارا دل مجھ سے بھر جائے تو تم مجھ کو اکیلا چھوڑ کر چلی جاؤ؟''

''شاید اُس کی کبھی نوبت ہی نہ آئے؟''

''یہ سوچ تمھاری ہے میری نہیں۔''

میرا لہجہ اتنا اونچا تھا کہ آس پاس کھانا کھاتے ہوئے لوگ ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔ مگر پیگی کی طرح مَیں ذرا بھی محتاط نہ ہوا۔ غضب ناک نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ وہ سر تھام کر رہ گئی تھی۔ ویٹر میرے کہے بغیر ہی بل لے کر چلا آیا تھا۔ مَیں نے اُسے چیک تک نہ کیا۔ نوٹ نکال کر پلیٹ میں پھینکے اور پیگی کو وہیں چھوڑ کر ریسٹورنٹ سے چلا آیا۔

یار دوستوں کے دل، دماغ اور گھر کے دروازے بند ہوتے ہوئے بھی میرے لیے بند

نہ تھے۔ چند گلے شکوے، ناراضگی اور بُرا بھلا کہنے سننے کے بعد زمین ہموار ہوگئی اور ہم نئے سرے سے ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک ہوگئے۔ میری ہر شام اُن کے ساتھ ہی گزرنے لگی۔ لیکن مَیں خود کو بہت ہی اکیلا اور زندگی سے کٹا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔ پیگی کی غیر موجودگی نے ایک ایسا خلا پیدا کردیا تھا کہ زندگی خالی خولی ہوکر رہ گئی تھی۔ کوئی بھی شے میرے دل کو بھاتی نہ تھی۔ دوستوں کو میری دلی کیفیت کا پورا پورا علم تھا اور اُن کی شعوری کوشش رہا کرتی کہ مَیں پیچھے مڑکر ہرگز نہ دیکھوں۔ بقول اُن کے دُنیا یہاں ختم نہیں ہوتی۔ ''وقت'' تو دُنیا کا عظیم ترین ڈاکٹر ہے۔ وہ ہر زخم بھر دیتا ہے۔ ہر خلا پُر کردیتا ہے اور ہر دُکھ کا مداوا بھی فراہم کرتا ہے۔ مگر اُن کے نیک مشورے، نصیحتیں اور ہمدردیاں مددگار ثابت نہ ہوا کرتیں۔ مَیں اندر سے واقعی ٹوٹ چکا تھا۔

لندن شہر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ''وقت'' نے ایک پرندے کی صورت یہاں اختیار کررکھی ہے۔ وہ مقامی لوگوں کے سروں پر سے کب، کہاں اور کیسے گزر جاتا ہے، کسی کو احساس تک نہیں ہوتا۔ ہر گزرتا دن میرے لیے مسیحا ثابت ہورہا تھا۔ زندگی کے ہنگاموں میں دھیرے دھیرے کھو جانے سے پیگی کی دوری اور جدائی کم پریشان کرنے لگی تھی۔ پھر ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ وہ محض ایک حسین یاد بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن یاد بھی کچھ ایسی کہ جب کوئی ایسا چہرہ یا بدن دِکھ جاتا جو پیگی سے مشابہت رکھتا ہوتو میرے سینے میں میٹھا میٹھا درد اُبھر آتا اور وہ گھنٹوں میرے ساتھ رہتا۔ ہر شے بدرنگ دِکھائی دیتی۔

ایک سہانی شام مَیں اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک پب میں بیٹھا پی رہا تھ۔ وہاں اتفاقاً پیگی کی ایک قریبی سہیلی سے ملاقات ہوگئی۔ سرسری باتوں کے بعد اُس نے بتلایا کہ اِن دنوں پیگی کا افیر (Affair) فرینک نام کے ایک جوان کے ساتھ زوروں پر چل رہا ہے۔ وہ پیار محبت میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ جلد ہی شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور ہنی مون سویڈن میں منانے کی سوچ رہے ہیں۔ میرا دل اُچھل کر حلق میں آگیا۔ لیکن مَیں لاتعلقی سے اُس کی باتیں سنتا رہا۔ مگر ابھی اگلا پل بھی نہ گزرا تھا کہ میرے ہاں فرینک کو دیکھنے کی زبردست خواہش

پیدا ہوئی۔ من میں آیا کہ فرینک کو پیگی کی موجودگی میں قریب سے دیکھا جائے اور کھلے بندوں اُس کا خود سے موازنہ کیا جائے کہ وہ کس زاویے سے مجھ سے بہتر اور برتر شخص ہے؟ یقیناً اُس میں کوئی خاص بات تو رہی ہوگی جس کی وجہ سے پیگی جیسی تجربہ کار اور دانا عورت اُس سے شادی کرنے کو راضی ہے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ مجھ میں جلن اور حسد جیسا جذبہ کیوں کر اُبھر آیا ہے؟ پیگی میری جائیداد، میری جاگیر تو ہے نہیں کہ اُسے میرے علاوہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ جیون گزارنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے؟ مَیں نے فوری طور پر اپنی خواہش کا گلا دبا ڈالا۔ لیکن مَیں اپنے باطن میں زیادہ خوش بھی نہ تھا۔

ایک روز کام سے فارغ ہو کر مَیں نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ مالک مکان نے آگاہ کیا کہ پیگی پچھلے ایک گھنٹے سے وقفے وقفے سے متواتر فون کرتی چلی آرہی ہے اور وہ جلد ہی مجھ سے ملنے کو آرہی ہے۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ سوچا اُسے دروازے سے ہی چلتا کر دوں۔ لیکن ایسا کرنا تو ''اخلاقاً'' اور ''تہذیباً'' غلط ہوگا۔ در پر تو دشمن بھی چلا آئے، اُس کا سواگت کرنا فرض سمجھا گیا ہے۔ پھر پیگی کے ساتھ تو برسوں کی رفاقت رہی تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد مَیں اور پیگی ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ہوئے تھے، مگر خاموش، مہر بہ لب، لاتعلق، وہ کچھ زیادہ ہی تھکی تھکی، بجھی بجھی سی تھی۔ بکارڈی کا جام اُس کے سامنے جوں کا توں دھرا تھا۔ سگریٹ کے کش پہ کش لیے جا رہی تھی۔ وہ آس پاس کی ہر شے سے بے نیاز خود میں اس قدر کھوئی ہوئی تھی کہ مجھ سے آنکھ بھی نہیں ملا پا رہی تھی۔ میرا ذہن بپھرے ہوئے گھوڑے کی طرح اِدھر اُدھر بھٹک کر جاننا چاہ رہا تھا کہ وہ ایک طویل خاموشی کے بعد آج اچانک یہاں کیوں آن دھمکی ہے؟ کوئی وجہ تو ضرور رہی ہوگی؟ لیکن مَیں کوئی نجومی تو تھا نہیں۔ اُسی کی زبانی آنے کا مقصد سننے کو بے تاب تھا۔ آخرش مجھ سے آنکھ ملائے بنا اور کرسی پر پہلو بدل کر اُس نے لب وا کیے:

''مَیں تھوڑی سی خود غرض ہوں.... اسی لیے تمھارے پاس آئی ہوں۔''

میں انجان بنا رہا۔

''اور یہ بھی بتاتی چلوں کہ میرے یہاں آنے کی وجہ صرف تم ہو؟''

''میں؟...... بھلا میں کیسے وجہ ہو سکتا ہوں.... تم نے آج تک مجھ سے پیار نہیں کیا؟''

''ہاں۔ یہ سچ ہے....اور یہ بھی سچ ہے کہ میں تم سے کبھی پیار نہیں کر سکتی.... ہماری ذہنی سطح الگ الگ تھی اور ہے۔''

''مگر اب تو تمھیں اپنی سطح کا پرنس چارمنگ مل گیا ہے؟''

اُس نے میرے لہجے کی کڑواہٹ اور طنز کو محسوس کر لیا تھا۔ اُس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ گلاس کا سہارا لیا، ایک دو گھونٹ بھر کر افسوس سے بولی:

''فرینک کی ذہنی سطح مجھ سے بھی بڑھ کر ہے.... بلا کا ذہین ہے.... آکسفورڈ یونیورسٹی کا ڈگری یافتہ ہے۔ گھنٹوں دُنیاوی موضوعات پر بات کرتے نہیں تھکتا... یقین کرو میں نے اُس کی صحبت میں ہر پل کا لطف اُٹھایا ہے۔''

''اچھا.... یہ تو خوشی کی بات ہے۔''

''مگر یہ سن کر تم کو حیرت ہوگی کہ پچھلے ہفتے میں نے اُسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔''

''کیا؟....''

یہ انکشاف میرے لیے ایک صدمے سے کم نہ تھا۔ مجھے پیگی کی ذہنی صحت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ ممکن ہے دو ڈگری یافتہ شخصیتیں آپس میں ٹکرا گئی ہوں اور انجام وہی علیحدگی... علیحدگی... علیحدگی۔

''میں فرینک کی بڑی قدر کرتی ہوں.... اور کرتی رہوں گی''

''تو پھر اُسے چھوڑا کیوں؟.... کیا کمی تھی اُس میں؟''

''وہی جو خوبی تم میں پائی جاتی ہے۔''

''مجھ میں؟''

''ہاں وہ تمھاری طرح جان دار نہیں تھا.... اُس کی مردانہ قوت کم تھی اور جنسی بھوک بھی۔''

مجھے لگا تار برقی جھٹکے لگ رہے تھے اور میں پیگی کے انوکھے تجربات سے الگ نہیں ہو پا رہا تھا۔ مگر

اچانک مجھے ہنسی آ گئی اور مَیں دیر تک ہنستا رہا۔ وہ دم بخود پریشان مجھ کو دیکھتی رہی۔ لیکن پیگی کی ٹریجڈی اس دوران میری سمجھ میں آ چکی تھی۔ مَیں نے اُس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا:

''تو تمھیں مکمل آدمی کی تلاش ہے؟''

''ہاں۔ کیوں نہ ہو؟ ابھی میری عمر ہی کیا ہے؟ ...مَیں جوان ہوں خوبصورت ہوں، ذہین ہوں، پڑھی لکھی ہوں۔ مکمل آدمی کی تلاش کیوں نہ ہو؟''

مَیں اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ اِس دُنیا میں ہر شخص کے ہاں کوئی نہ کوئی کمی پائی جاتی ہے۔ پورا آدمی تو ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملتا۔ پھر جو شخص واہموں کے سہارے زندہ رہتا ہے، وہ اپنی قبر بھی خود کھودنے لگتا ہے۔ مَیں ڈرتا ہوں تمھارا حشر بھی ویسا ہی نہ ہو۔ مگر یہ سب کہنے کے بجائے مَیں نے اُس سے کہا:

''مجھے افسوس ہے کہ فرینک کے ساتھ تمھارا سلسلہ ختم ہوگیا ہے.... مگر تم میرے پاس کیوں آئی ہو؟''

''مَیں پریشان ہوں، انتہا کی حد تک.... آج مجھ کو تمھاری ضرورت ہے.... صرف آج کی رات... انکار مت کرنا ورنہ مَیں تم کو دُنیا کا سب سے بڑا مجرم سمجھوں گی۔''

اور مَیں واقعی انکار نہ کر پایا۔

شب بھر وہ میرے بدن سے لپٹی رہی۔ جیسے وہ ہی اُس کی زندگی کا مرکز رہا ہو۔ وہ ہی اُس کی زندگی کا محور تھا اور اب وہ اُس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ میرا انگ انگ چوم کر وہ چھوٹی بڑی سِسکیاں بھی بھرتی رہی۔ سمے اپنی گتی چلتا رہا۔ مگر پیگی کی کوئی بھی سِسکی، کوئی بھی حرکت میرے جذبات کو چھو نہ پائی۔ مَیں دل کڑا کیے پڑا رہا۔ سوچتا رہا کہ عقل بھی آدمی کو کیسے کیسے دھوکے دیتی ہے؟ کبھی وہ اپنی ذہانت کا غلام بن جاتا ہے، کبھی اپنی خواہشات کا اور کبھی اپنی جبلتوں کا۔ لیکن میرے دل پر رکھا پتھر اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ سرکا۔

کار موٹروے کو چھوڑ کر میری رہائش گاہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ مَیں پیگی کے ساتھ بیتے ہوئے ماہ و سال کے تمام اوراق پلٹ کر بھی خود کو اُس سے الگ نہیں کر پایا۔ وہ میرے

اندرونی نظام میں کہیں نہ کہیں ضرور انگی ہوئی ہے؟ اُسے اپنے جیون میں پھر سے آنے کی دعوت دے کر میں خود ہی اپنے پھینکے ہوئے جال میں اُلجھ کر رہ گیا ہوں۔ مجھے خوف سے زیادہ یقین ہو چلا ہے کہ پیگی جلد ہی اپنے نئے عاشق کو چھوڑ بیٹھے گی اور ایک شام مَیں گھر میں قدم رکھوں گا تو مالک مکان بتائے گا کہ پیگی اوپر کمرے میں بیٹھی میری راہ دیکھ رہی ہے۔ جانے اُس وقت میری حالت کیا ہوگی؟

اسٹیرنگ میرے ہاتھوں سے چھوٹنے لگا۔

☆☆

دیس پردیس

مَیں خوش تھا اور اپنے مقدر کو سراہ رہا تھا کہ کمپنی کی جو شاخ لندن میں قائم تھی اُس کے بورڈ آف ڈائرکٹرز نے شعبۂ اکاؤنٹ میرے ذمہ کر دیا تھا۔ مَیں بائیس ہزار فُٹ کی بلندی پر ائیر انڈیا کے جہاز کی کھڑکی سے باہر چھوٹے بڑے بادل دیکھ رہا تھا۔ دھرتی کا سینہ غائب تھا۔ اچانک ائیر ہوسٹس کی مدھر آواز میرے کانوں سے ٹکرائی:

''ہم کچھ ہی سمے میں ہیتھرو ائیر پورٹ پر اُترنے والے ہیں۔ یاتریوں سے نویدن ہے کہ وہ اپنی سیٹ کے رکھشک بندھ باندھ لیں۔ دھنیہ واد۔'' یہ سننا تھا کہ میرا دل دھڑک اُٹھا، اس خیال کے ساتھ کہ مجھے تین برسوں تک ایک نئے ملک میں رہنا ہوگا۔ جہاں کی سوسائٹی، قدریں، روایات، ماحول سب ہی نیا ہوگا۔ تیز گام زندگی کے ساتھ سفید فام لوگ بھی ہوں گے، جن کے آباواجداد ہمارے حکمراں بھی رہ چکے ہیں۔ اِس نئے پن کے احساس نے میرے اندر عجب سا خوف پیدا کر دیا تھا۔ دور دراز کے چند رشتے دار لندن میں ضرور قیام پذیر تھے۔ دو ایک دوست بھی وہاں موجود تھے جن میں اپنا جانی بھی تھا۔ مگر دل تھا کہ وہ اوپر نیچے ہونے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ لیکن

جب جانی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے اُبھر کر اپنی صورت اختیار کر بیٹھا تو دل آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگا۔ سانولا رنگ، گھنے خشک بال، چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور چوڑا ماتھا۔ اُس کا پیدائشی نام تو بدری نارائن تھا مگر اُسے اپنے دقیانوسی نام سے اس قدر چڑ تھی کہ وہ خود کو بنام جانی کہلوانا پسند کرتا تھا۔ ہر کوئی کالج اور دوستوں کے حلقے میں اس کی دلی خواہش کا احترام کرتا تھا۔ لیکن جانی صحیح معنوں میں میرا جانی تھا۔ وہ میرا دن کا ہی نہیں شب کا ساتھی بھی تھا۔ اُس نے بمبئی کی ہر سڑک پر اپنے پیروں کی چھاپ میرے ساتھ چھوڑی تھی۔ ہر گلی کی سڑاند اور خوشبو بھی میرے ساتھ سونگھی تھی۔ حتیٰ کہ اُٹھتی جوانی میں بدنام علاقوں کی تفریح بھی میرے ساتھ کی تھی۔ مگر وہ تھا بڑا زمانہ ساز۔ مجھ سے کم پڑھا لکھا ہونے کے باوجود دُنیاوی معاملات میں مجھ سے کئی قدم آگے تھا۔ آنے والے وقت پر یوں آنکھ رکھا کرتا تھا کہ موقع ملتے ہی اُسے ہڑپ کر لے گا۔ وہ کوئی بھی موقع ہاتھ سے گنوانے کے حق میں نہ تھا۔ ذاتی مفاد کو خود سے الگ کرنا اُس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ لیکن پھر بھی مجھے اُس سے اُنس تھا، محبت تھی۔ اس لیے کہ ہر شخص میں چند خامیاں تو ہوتی ہی ہیں جن کی بنیاد پر اُس کی دیگر خوبیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُن ہی دنوں اُس نے یونیورسٹی کی ایک لیکچرار پر، جو عمر میں اُس سے چار پانچ سال بڑی تھی اور جسے برطانیہ سرکار کی طرف سے انگلینڈ آنے کا پروانہ بھی مل چکا تھا، اپنا جال اتنی چابک دستی سے پھینکا کہ وہ اُس میں اُلجھ کر رہ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ جانی پر تن من دھن سے فدا ہو گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ جانی انگلینڈ جانے کے خواب دیکھنے لگا۔ چند ہی ہفتوں میں اُس کے خواب حقیقت میں بدل گئے، جب وہ معمولی ناک نقشہ، متناسب قد کاٹھ اور لاغر بدن رکھنے والی لیکچرار سے شادی کر کے لندن روانہ ہو گیا اور وہیں اُس نے مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ابتدا میں وہ اپنے حال احوال سے ضرور آگاہ کرتا رہا پھر ہمارے درمیان ''وقت'' آنکھ سے دور دل سے دور کی صورت اختیار کر بیٹھا۔ یوں بھی وقت جدید اور مادہ پرست دُنیا میں خدا سے اونچا رتبہ رکھتا ہے۔ اس کارن فاصلے ہمارے درمیان اتنے بڑھ گئے تھے کہ صرف نئے سال کے موقع پر ہی مبارک بادی کارڈ آنے لگا۔ لیکن اُسے موصول کرنے پر بھی مجھے خوشی ہوا کرتی تھی کہ میرا یارِ غار زندہ ہے اور وہاں کے مزے لوٹ رہا ہے۔ پھر یہ سلسلہ بھی جلد ختم ہو کر رہ گیا۔

کمپنی کا ایک انگریز ملازم مجھے ایئر پورٹ سے مرکزی لندن کے ایک سستے سے ہوٹل میں چھوڑ کر چل دیا تھا، یہ کہتے ہوئے کہ مجھے فلیٹ کی چابی چند دنوں میں مل جائے گی۔ تب تک مَیں لندن شہر کا نظارہ کروں اور موسم کے تیور دیکھوں۔ نہا دھو کر اور تازہ دم ہو کر مَیں نے جانی سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ شام کے آٹھ بج رہے تھے مگر ہر طرف اُجالا تھا۔ یورپ میں موسمِ گرما کی شام خاصی لمبی ہوا کرتی ہے۔ کہیں نو بجے کے بعد اندھیرا دبے پانو وارد ہوتا ہے۔ اُمید نہیں تھی کہ جانی گھر پر ہوگا، مگر خلافِ توقع وہ گھر پر ہی تھا۔ اُسی نے رسیور اُٹھایا۔ بات چیت کے دوران بار ہا مجھے احساس ہوا کہ شاید غلط نمبر لگ گیا ہے اور مَیں کسی انڈین کی بجائے کسی انگلش آدمی سے ہم کلام ہوں، جس کا لہجہ، تلفظ، جملوں کی ساخت، الفاظ کی بندش سراسر میرے لیے اجنبی تھے اور باوجود کوشش کے کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہے تھے۔ لیکن ایک مَیں تھا کہ اپنی زبان بولنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ مگر وہ میری ہر بات کا جواب انگریزی میں دیے جا رہا تھا۔ مَیں جھنجھلا اُٹھا اور غصے میں بولا:

''ارے او شیکسپیئر کی اولاد۔ تم سالے انگریز کب سے بن گئے؟ اپنی اوقات پر آؤ اور مجھ سے اپنی زبان میں بات کرو۔''

خاموشی چھا جانے پر مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ میرے تیز جملے اُس پر اثر کر گئے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی زبان میں بات کرنے لگا۔ مگر اُس کا ہندوستانی لہجہ بھی کچھ کچھ بدلا سا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس نے مجھے اپنے گھر پہنچنے کی تفصیلی ہدایات دیں اور مَیں نے اُس سے بروز سنیچر بعد دوپہر ملنے کا وعدہ کر لیا۔

جانی لندن کے ایک امیر علاقے، ایلنگ براڈوے میں مقیم تھا، جو میرے علاقے سے زیادہ دور نہ تھا۔ مَیں صبح سے ہی اپنے یارِ غار سے ملنے کا مشتاق تھا۔ وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مَیں نے مقررہ وقت سے پہلے ہی اُس کے مکان پر پہنچ کر اطلاعی گھنٹی بجا دی۔ دروازہ وا ہونے تک مَیں نے آگے کا مختصر سا باغیچہ دیکھا جو خوشبودار پھولوں سے لدا پھندا تھا۔

ڈرائیو وے میں دو چمچماتی کاریں بھی کھڑی تھیں۔ دروازہ کھلا تو جانی قیمتی لباس پہنے میرے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے کی مسکراہٹ میرا خیر مقدم کر رہی تھی۔ میرا چہرہ بھی ویسی ہی دلکش مسکراہٹ سے بھر گیا تھا، جس کے پیچھے برسوں کی یادیں، باتیں، واقعات اور زندگی کے گوناگوں پہلو تھے۔ بازو پھیلا کر میں اُس سے بے تحاشا لپٹ گیا۔ وہ بھی مجھ سے بغلگیر ہو گیا۔ کچھ دیر تک ہم بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ مگر اُس کی گرفت میں وہ برسوں پہلے والی گرمجوشی نہ تھی۔ ہاتھوں میں وہ دباؤ نہ تھا۔ خون میں وہ گرمی نہ تھی۔ تاہم اُس نے میری پشت سے ہاتھ نہ ہٹایا اور اُسی انداز میں ''پلیز کم ان۔ کم اِن۔'' کہتا ہوا مجھے لاؤنج میں لے آیا۔ صوفے پر بیٹھ کر میں نے گردو پیش میں نگاہ دوڑائی، بے حد خوبصورت لاؤنج تھا۔ قیمتی فرنیچر سے سجا دھجا، جو امیر طبقے کے گھروں کا ہوا کرتا ہے۔ اگلے پل ہی میری آنکھوں میں ہوسٹل کا وہ بے ترتیب اور مختصر سا کمرہ گھوم گیا، جہاں جانی رہا کرتا تھا۔ میں سوچتا رہ گیا کہ آدمی وقت کے ساتھ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے اور کیا سے کیا حاصل کر لیتا ہے۔ مگر جانی بڑا زیرک تھا اور ہوشیار بھی۔ فوراً میرے ذہن سے ہو کر میری سوچ تک پہنچ گیا تھا۔ روبرو بیٹھ کر اپنے مخصوص انگریزی لب و لہجے میں گوش گزار ہوا:

''اگر میں انڈیا میں رہ جاتا تو ہوسٹل کے کمرے سے ایک اوسط درجے کے فلیٹ تک ہی پہنچ پاتا۔''

''یہ تو محض موقع کی بات ہے۔''

''EXACTLY۔ وہاں لوگ زیادہ ہیں اور مواقع کم .... نظام کا ڈھرا کچھ یوں رکھا گیا ہے کہ ہمارے واسطے وہاں جدوجہد کے سوا باقی کچھ نہ تھا۔''

''تم کچھ بھی کہو.... مگر ہے وہ ہمارا مہان دیش.... یقین کرو مجھے آئے ہوئے چند روز ہی ہوئے ہیں مگر اپنا دیش رہ رہ کر یاد آ رہا ہے۔''

''شروع شروع میں ایسا ہوتا ہے.... لیکن وقت گزرنے پر بہت کچھ بدل جاتا ہے۔''

اُس نے سگریٹ سلگایا اور اپنی بات کو جاری رکھا:

''یہاں کی سوسائٹی بڑی انوکھی ہے۔ پہلے برس میں وہ نو وارد کی ذہنی نسوں تک کو ہلا دیتی ہے اور وہ واپس جانے کی سوچتا ہے۔ پھر دوسرے برس میں اُس کی نسیں معمول پر آنے لگتی ہیں اور تیسرے

برس یہ سوسائٹی اُس کی ذات میں یوں رچ بس جاتی ہے کہ پھر وہ دُنیا کے کسی خطے میں بھی نہیں رہ پاتا ہے۔''

اُس نے دادطلب نظروں سے دیکھا۔ مجھ کو مجبوراً کہنا پڑا:

''تم تو یہاں کی سوسائٹی کا نچوڑ نکالے بیٹھے ہو؟''

''تم کہہ سکتے ہو کہ ہاں....دراصل یہاں کی سوسائٹی پڑھے لکھے آدمی کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ اُس کی جڑیں کہاں ہیں؟''

پھر میرے استفسار کرنے پر کہ اُس کی پروفیسر بیوی دِکھائی نہیں دے رہی اور اب وہ کتنے بچوں کا باپ بن چکا ہے کہ مجھے صرف ایک کا علم تھا۔ اُس نے فخریہ بتایا کہ اب وہ دو بیٹوں کا باپ ہے۔ راکی دس برس کا ہے اور جمی سات کا۔ وہ ان دنوں اپنی ماں کے ساتھ انڈیا گئے ہوئے ہیں۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا:

''تم کیوں نہیں گئے؟ چھٹی نہیں ملی کیا؟''

''نہیں ایسا نہیں ہے....مَیں گیا تھا پچھلے برس ایک ماہ کے لیے....مگر مشکل سے پندرہ روز وہاں رہ پایا....وہ بھی گھر والوں کے اصرار پر۔''

''کیوں دل نہیں لگا وہاں؟''

اُس کے چہرے کی رنگت گہری ہوگئی تھی۔ آنکھیں اُداس ہوگئی تھیں۔ گویا پچھتاوے کا کوئی احساس ہو جو اُسے تنگ کر رہا ہو اور وہ اُس سے نجات پانا چاہتا ہو۔ بولا:

''مجھے وہاں کی ہر شے بدلی بدلی سی لگی؟''

''ہاں یہ تو ہے۔ بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں وہاں....اپنے دیش نے خوب ترقی کی ہے۔ سماج کا ڈھانچہ بھی بدل گیا ہے۔ غربت بھی کافی حد تک دور ہوئی ہے۔''

''یقین جانو۔ برسوں پہلے جن بُری بھلی اشیا، دوستوں اور رشتہ داروں سے میرا تعلق تھا وہ سب کے سب مجھے بے گانے لگے۔'' وہ کہتے کہتے اچانک رُک گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بے دلی سے بولا:

''تم کہہ سکتے ہو کہ مَیں بدل گیا ہوں۔ میرے سوچنے سمجھنے اور دیکھنے کا، ڈھنگ بدل گیا ہے....

یقین کرو میں وہاں خود کو اجنبی محسوس کر رہا تھا۔''
''اجنبی؟''
میں ششدر اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ اپنے ہی دیش میں خود کو اجنبی محسوس کر رہا ہو؟ جب کہ اُس کا خمیر اپنے دیش کی دھرتی، مٹی اور تہذیب سے اُٹھا ہو؟ آدمی اپنے دیش سے کتنا ہی دور کیوں نہ چلا جائے وہ جذباتی طور پر اُس سے جڑا رہتا ہے۔ مگر جانی زیرک تھا۔ ایک بار پھر میرے ذہن سے ہو کر میری سوچ تک پہنچ گیا تھا۔
''مجھے غلط مت سمجھنا.... مگر حقیقت یہ ہے کہ میرے واسطے اب وہاں کچھ باقی نہیں رہا۔ کوئی بھی پُرانا سمبندھ، چہرہ، سڑک، مقام، ریستوراں، عمارت، گہری یاد ایسی نہیں رہی جو مجھ کو اپنی طرف کھینچتی ہو یا میرے واسطے کوئی کشش رکھتی ہو۔''
''یعنی ہر شے کے ساتھ تمھارا رشتہ ختم ہو چکا ہے؟''
''تم کہہ سکتے ہو کہ ہاں .... اور اگر ہے بھی تو وہ محض برائے نام ہے .... دراصل وہ اپنی طاقت کھو بیٹھا ہے۔''
''طاقت کھو بیٹھا ہے؟....وہ کیسے؟'' میری حیرانگی بڑھ رہی تھی۔
خاموش رہ کر اُس نے مجھے اِس انداز سے دیکھا کہ وہ جو کچھ کہنے جا رہا ہے، مَیں اُسے سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہوں یا نہیں؟....دھیرے سے اُس نے اپنے لب کھولے:
''اُس کی وجہ موجودہ زندگی، فاصلے اور دوری ہے.... برسوں یہاں رہ کر مَیں وہاں کی ہر شے سے کٹتا چلا گیا۔ اُس کا ہولے ہولے اپنی اہمیت کھونا قدرتی امر تھا۔ مَیں یہاں کی زندگی میں اتنا ڈوب گیا کہ وہ میری ذات کا حصہ بن گئی اور وہاں کی ہر شے اجنبی بنتی چلی گئی۔ اِس کا احساس مجھے انڈیا پہنچ کر ہوا۔''
خاموش رہنا ہی میرے لیے مناسب تھا کہ اُس نے کچھ اس طرح کا غیر دلچسپ اور خشک موضوع چھیڑ ڈالا تھا کہ مجھ جیسے شخص کو اُس میں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ مَیں تو اس خیال میں تھا کہ وہ بغلگیر ہوتے ہی پوچھے گا کہ مَیں بیتے سالوں میں کیا کرتا رہا؟ زندگی نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا؟

شادی کی یا نہیں؟ اِن دنوں کیا کر رہے ہو؟ انگلینڈ کیسے آنا ہوا؟ کب تک یہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

کچن سے لوٹ کر اُس کے ہاتھوں میں دو ہلکے پھلکے پکوان کی پلیٹیں تھیں۔ کیبنٹ سے وہسکی کی بوتل نکال کر وہ گلاس بنانے میں مصروف ہوگیا۔ مَیں نے پہلو بدل کر لاؤنج کے ہر کونے پر نگاہ ڈالی۔ بغور جائزہ لینے پر بھی مجھے کوئی حصہ، کوئی شے ایسی دکھائی نہ دی جس سے ہندوستانی ثقافت کا کوئی رنگ جھلکتا ہو اور نو وارد کو فوری احساس ہو کہ وہ کسی ہندوستانی گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔ جب کہ مَیں اپنے آشناؤں کے گھروں پہ کیا کچھ نہیں دیکھ چکا تھا۔ کہیں ٹیلی وژن پر چھوٹا سا مور پنکھ پھیلائے کھڑا ہے تو کہیں پنجاب کی نئی نویلی دُلہن گڑیا کے روپ میں کارنس پر سجی دھجی ہے۔ کہیں مراد آبادی گلدان دھرا ہے تو کہیں کشمیری لیمپ اسٹینڈ۔ کسی کونے میں بھگوان شیو کا بُت رکھا ہے تو کسی دیوار پر گرونانک جی کی تصویر آویزاں ہے۔ پھر صاحبِ خانہ نے چھوٹتے ہی اپنے دیش کے بدلتے ہوئے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات جاننا چاہے تھے۔ کسی گھر میں میزبان نے دیش کی بڑھتی ہوئی آبادی، کرپشن، مہنگائی اور فرقہ وارانہ کشیدگی کے متعلق جاننا چاہا تھا۔ غرض یہ کہ مَیں ہر جگہ ایک ہی احساس سے دوچار رہا کہ وہ تمام لوگ ہزاروں میل دور رہ کر اپنے دیش کے کتنے قریب ہیں اور ہر لحاظ سے اُس کی بہتری کے خواہشمند ہیں۔ مگر ایک جانی تھا، جس نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ سے بنا رکھی تھی اور خود ہی اذان دے رہا تھا۔ کیا ایک ہی آدمی مختلف حالات میں مختلف پایا جاتا ہے؟ اِس سوچ کے ساتھ مَیں نے یہی مناسب سمجھا کہ موضوع بدل دیا جائے۔ لہٰذا گلاس ٹکرا کر مَیں نے پوچھا:

''سُنا ہے اس علاقے میں اپنے لوگ کافی رہتے ہیں؟''

''ساؤتھ ہال کا علاقہ ہم سے زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں بھاری تعداد میں اپنے لوگ آباد ہیں.... لیکن مَیں بہت کم کو جانتا ہوں.... جن کو جانتا بھی ہوں اُن کو فاصلے پر رکھتا ہوں۔''

اُس نے رُک رُک کر بے دلی سے جوب دیا تھا۔ مَیں پوچھے بغیر نہیں رہ پایا:

''تم اُن سے ملنا پسند نہیں کرتے یا وہ اس قابل نہیں ہیں کہ تم تک پہنچ پائیں؟''

’’تم کچھ بھی سمجھ لو۔‘‘
یہ کہہ کر وہ ماضی میں کھو گیا:
’’میں تازہ تازہ جب اس دیش میں سیٹل (SETTLE) ہوا تھا تو اپنے لوگوں سے دل کھول کر ملا تھا.... لیکن آہستہ آہستہ دور ہوتا چلا گیا۔‘‘
’’کیوں؟....کوئی خاص وجہ تھی؟‘‘
’’یہاں ہر کوئی پیسا بنانے کی غرض سے آیا ہے۔ ہر کسی کو موقع کی تلاش ہے.... پھر جب ہم کو احساس ہوا کہ پڑھے لکھے اور اَن پڑھ طبقے کی سوچ الگ الگ ہے اور ہم میں تہذیبی فاصلے بھی موجود ہیں تو ہم اُن سے دور ہوتے چلے گئے۔‘‘
’’یعنی یہاں کوئی انڈین فیملی ایسی نہیں جس سے تمھارے گھریلو تعلقات ہوں؟‘‘
’’نہیں ایسا تو نہیں ہے.... دو تین تعلیم یافتہ خاندان یہاں ضرور ہیں جو ہمارے بہت قریب ہیں۔ وہ بھی ہم جیسی سوچ رکھتے ہیں۔ انھوں نے بھی شروع میں وہی محسوس کیا جو ہم نے کیا تھا۔‘‘
’’یہ تو خوشی کی بات ہے۔ ورنہ پردیس میں آدمی اپنوں کے بغیر رہ نہیں پاتا؟‘‘
اُس کے ہونٹوں پر جانے کیوں پھیکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی تھی، جو برملا میرا مذاق اُڑائے جا رہی تھی۔ میری سمجھ میں ذرا بھی نہیں آ رہا تھا کہ مَیں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے کہ اُس کے چہرے کے تأثرات ہی بدل کر رہ گئے ہیں۔ چند گھونٹ بھرنے پر وہ مزید شاداب دِکھنے لگا۔ مجھے سمجھاتے ہوئے فخریہ بولا:
’’پہلی بات تو یہ ہے کہ مَیں پردیس میں نہیں اپنے دیش میں رہ رہا ہوں۔ مَیں نے یہاں کی شہریت حاصل کر لی ہے....اب مَیں انڈین نہیں برٹش ہوں اور یہ میرا دیش ہے۔‘‘
اُس کی باتوں سے زیادہ اُس کی شراب مجھ پر اثر چھوڑ رہی تھی۔ مگر یہ جان کر کہ اب وہ برٹش ہے اور یہ اُس کا دیش ہے، نشہ اُترنے لگا۔ مَیں نے بوتل اُٹھا کر ایک جاندار پیگ بنایا:
’’مگر جانی تم تو اپنی صورت سے مجھ کو ہندوستانی دِکھ رہے ہو۔ تم برٹش کیسے بن گئے؟‘‘
’’وہ یوں کہ میرے پاس برٹش پاسپورٹ ہے اور اُسے مَیں نے سوچ سمجھ کر حاصل کیا ہے۔‘‘

میرے اندر ہنسی کا طوفان اُمڈ آیا تھا۔ دل نے فلک شگاف قہقہہ بلند کرنا چاہا۔ مگر میں نے دل کو مارا۔ ہنسی کو دبایا اور خواہش پر پہرہ بٹھا کر تصدیق کرنی چاہی:

''میں سمجھ گیا... یہاں کی شہریت حاصل کر لینے کے بعد اب تم کو انگلینڈ سے کوئی نکال نہیں سکتا۔''

''تم غلط سوچ رہے ہو۔ انڈیا سے لوٹنے پر میں نے برٹش پاسپورٹ حاصل کیا ہے.... ماحول کا اثر گہرا ہوتا ہے۔ میں جہاں ملازم ہوں وہاں سب انگلش کام کرتے ہیں.... میرا اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، گھومنا پھرنا زیادہ تر اُن ہی لوگوں کے ساتھ رہتا ہے.... پھر میری مسز کے جاننے والے بھی تمام انگلش ہیں۔ ہمارا دیکھنا، سوچنا اور جیون گزارنے کا ڈھنگ بدل چکا ہے۔''

''مانا کہ تم اوپر سے نیچے تک بدل چکے ہو۔ تاہم زندگی کے ہر موڑ پر تم انڈین ہی کہلائے جاؤ گے۔''

اُس نے آنکھیں سکوڑ کر مجھے اس انداز سے دیکھا کہ وہ میری بات سمجھ کر بھی سمجھ نہ پایا ہو۔ میں اس سوچ میں تھا کہ جو حقیقت وہ برسوں یہاں رہ کر بھی سمجھ نہ پایا، میں چند دنوں کے قیام کے بعد ہی جان گیا تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ وہ تو بلا کا دانا اور زِیرک ہے۔ کیا اُسے اتنا بھی علم نہیں کہ اُس کے چہرے مہرے پر اپنے چھوڑے ہوئے دیش کا نام لکھا ہوا ہے، جو مرتے دم تک لکھا رہے گا۔ پھر وہ برٹش کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ جس نسل سے اُس کا تعلق ہے اُس کی جڑیں ہندوستان میں ہیں، یہاں نہیں۔ البتہ آنے والی ایشیائی نسل ضرور برٹش ہوگی، مگر اُسے بھی شناخت کا مسئلہ درپیش رہے گا۔ میرے رویّوں نے واقعی اُسے اُلجھا ڈالا تھا۔ کبھی وہ دانتوں سے ہونٹ کاٹ رہا تھا تو کبھی تلخ حقائق میں اُتر رہا تھا۔ گلاس اُٹھا کر گھونٹ بھرتا رہا۔ پھر معاً بول اُٹھا:

''مت بھولو کہ اب ہمیں یہیں رہنا ہے.... اس دیش کو اپنا کر، اس کا اٹوٹ حصہ بننا ہے.... مقامی لوگوں کو ہم سے یہی شکایت ہے کہ ہم اُن سے پرے پرے رہتے ہیں۔ یہاں کی سوشل لائف میں بڑھ چڑھ کر شامل نہیں ہوتے.... اگر ہمارا رویہ نہ بدلا تو ہم مرکزی دھارے سے ہمیشہ کٹ کر رہیں گے۔''

مَیں خاموش رہ گیا۔ حالاں کہ میرے اندر کوئی شے مجھے شدت سے اُکسا رہی تھی کہ اُس کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردے کو نوچ کر اُسے آگاہ کروں کہ شہریت بدلنے سے سرکاری نظروں

میں شناخت ضرور بدل جایا کرتی ہے مگر عوام کی نظروں میں نہیں۔ اُسے بدلنے کے واسطے آدمی کو اپنا رنگ روپ، چمڑی سب بدلنا پڑتا ہے۔ جو ممکن نہیں۔ پی پلا کر میں نے جانے کی اجازت چاہی۔ اُس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی۔ شام ہو چلی تھی۔ لیکن اُس نے میرا دل رکھنے کی خاطر اتنا بھی نہ کہا کہ کھانا کھا کر جانا۔ البتہ یہ ضرور کہا کہ وہ مجھے اپنی کار میں ضرور چھوڑ آتا، جہاں کہیں بھی مَیں ٹھہرا ہوا ہوں۔ مگر اُس نے میرے آنے کی خوشی میں چوں کہ زیادہ پی لی ہے، اُسے ڈر ہے کہ کہیں پولیس کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ ورنہ وہ ڈرائیونگ لائسنس سے بھی جاتا رہے گا۔ میں کہنا چاہتا تھا:

''یار زندہ صحبت باقی'' مگر میرے لبوں نے ساتھ دینے سے صاف انکار کردیا۔ وہ دروازے تک میری کمر میں ہاتھ ڈالے مجھے چھوڑنے کو آیا اور مصافحہ کرتے ہوئے بولا:

''ملتے رہنا۔ BE IN TOUCH۔''

لیکن میرے ہونٹوں میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ نہ کوئی مسکراہٹ اُبھری اور نہ ہی مَیں نے اُس کے کہے کا کوئی نوٹس لیا۔ میں پتھرایا ہوا اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

انڈر گراؤنڈ اسٹیشن کی طرف بڑھتے ہوئے میرا جذباتی توازن اتنا بگڑ چکا تھا کہ وہ ناقابلِ بیان ہے۔ مَیں جیون میں کبھی اتنا نراش نہیں ہوا تھا، جتنا جانی سے مل کر ہوا تھا۔ آدمی کتنا بھی کامیاب کیوں نہ ہو جائے؟ کتنا بھی اونچا سماجی رتبہ کیوں نہ حاصل کرلے؟ کتنا بھی مالدار کیوں نہ بن جائے؟ مگر کسی دیرینہ دوست سے مل کر وہ سب کچھ فراموش کر بیٹھتا ہے اور تمام دیواروں کو گرا کر پُرانی سطح پر کچھ دیر کے واسطے پھر سے جی اُٹھتا ہے۔ مگر جانی میں اتنا بھی خلوص نہ رہا تھا کہ وہ مجھ سے برائے نام ہی پوچھ لیتا کہ مَیں انگلینڈ کس غرض سے آیا ہوں؟ کہاں ٹھہرا ہوں؟ کیا کرنے کا ارادہ ہے یہاں؟ مگر اُس نے میرے ساتھ یوں برتاؤ کیا تھا، جیسے کوئی واقف کار کسی شخص سے ملنے اُس کے گھر پر چلا جائے۔ لیکن میزبان، مہمان کا مقصد جانے بغیر اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ کر اُسے چائے کا پیالہ پلا کر چلتا کر دے۔ مگر جانی نے مجھ کو چائے کی جگہ شراب پلائی تھی اور وہ بھی اسکاچ۔

مجھے فلیٹ کی چابی مل گئی تھی۔ کمپنی کے پہلے والے ملازم نے فلیٹ کو نہایت قرینے سے رکھا تھا۔ فوراً ہی مَیں نے اپنے دور دراز کے رشتے داروں اور آشناؤں کو اپنی رہائش گاہ اور فون نمبر سے آگاہ کرنا چاہا۔ اُس وقت مجھے جانی کا بھی خیال آیا، جو دہلی اندرا گاندھی ایرپورٹ سے میرے ساتھ رہا تھا۔ لیکن ....؟؟ عزتِ نفس میرے آڑے آ گئی تھی۔ ضمیر کے آگے اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہو چکی تھیں۔ اُنھیں گرانا یا پھلانگنا میرے دائرۂ اختیار سے باہر تھا۔ اس لیے کہ ایک انڈین اور ایک برٹش شخص کی سوچ میں ہمیشہ سے فرق رہا ہے۔

مَیں پابندی سے اپنے کام کاج میں جُٹ گیا۔ مجھے نئے معاشرے کے تضادات، اقدار، روایات، مقامی لوگوں کی سوچ، رویے اور تیز گام زندگی کے مختلف پہلو سمجھ میں آنے لگے۔ آدمی کا ذہن کچھ کھلا ہوا ہو اور وہ نظر بھی تیز رکھتا ہو تو اُسے اندھیرے میں بھی چیزیں دِکھنے لگتی ہیں۔ مَیں نے یہی دیکھا اور یہی جانا کہ سوسائٹی کی بنیاد INDVIDUALISM پر رکھی گئی ہے۔ کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے معاملے میں دخل دینا پسند نہیں کرتا۔ کوئی دوسرے کی مدد نہیں کرتا۔ ہر کوئی اپنے مسائل خود حل کیا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ محض اپنے لیے زندہ ہے۔ اُسے نہ تو دوسرے سے کوئی ہمدردی ہے اور نہ ہی کوئی واسطہ۔ بس وہ تو بذاتِ خود معاشرے میں ایک چلتی پھرتی، سوتی جاگتی اکائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کا فیملی یونٹ کمزور قرار دیا گیا ہے۔

میرے قیام کو قریب قریب ایک برس ہو چکا تھا۔ اُن ہی دنوں ملک کے پارلیمانی انتخابات کا اعلان ہوا۔ تاریخ مقرر کر دی گئی۔ اہم سیاسی پارٹیاں لیبر، ٹوری، اور لبرل کے سربراہ اور سیاست داں مکمل جوش و خروش سے اپنے خیالات اور پالیسیوں کا اظہار کرنے لگے۔ ٹوری پارٹی کی لیڈی لیڈر نے تارکینِ وطن (ایمگرانٹز) کی بڑھتی ہوئی آبادی، اُن کا کاروباری میدان میں بے پناہ کامیابی کے ساتھ مزید پھیلاؤ اور سوسائٹی میں اپنی جڑوں کو مضبوط بناتا دیکھ کر اپنی

ایک تقریر میں چند ایک ایسے جملے ادا کیے کہ نسلی تعلقات کی فضا بگڑ کر رہ گئی۔

"PEOPLE SAY OUR CULTURE WILL BE SWAMPED. OUR VALUES AND TRADITIONS WILL BE IN DANGER." اس تقریر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ سفید برادری کے دلوں میں تارکینِ وطن کے لیے ناپسندیدگی اور نفرت کی دبی ہوئی لہر پھر سے اُبھر آئی۔ میڈیا نے ہمیشہ کی طرح ایمگریشن کے سنگین مسئلے کو اُچھالا۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر بحث و مباحثے شروع ہو گئے۔ لیبر اور لبرل پارٹیوں کے ذمہ دار سیاست دانوں نے دائیں بازو کی لیڈی لیڈر کے خیالات کی پُر زور مذمت کی۔ مگر نسلی تناؤ میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ وہ روز بروز بڑھنے لگا۔ ردِعمل یہاں تک ہوا کہ ایک ایشیائی نوجوان کو لب سڑک قتل کر دیا گیا۔ مندر، مسجد اور گردوارے پتھراؤ کی زد میں آ گئے۔ کئی دُکانیں توڑ پھوڑ دی گئیں اور اُن کے مالک سہمے سہمے سے خود کو پردیس میں انتہائی غیر محفوظ پانے لگے۔ لیکن مَیں ان تمام واقعات سے دور اِس سوچ میں گم تھا کہ اکثریت دُنیا کے ہر علاقے میں اقلیت کو کم تر سمجھا کرتی ہے اور اُسے گھٹنوں کے بل چلنے پر مجبور کرتی ہے۔ مَیں ہر صبح کام پر جاتے ہوئے اور شام کو لوٹتے وقت بھی محتاط رہنے لگا تھا۔

ایک صبح دفتر جاتے وقت مَیں شیفرڈ بُش اسٹیشن سے لوکل ٹرین میں داخل ہوا۔ ڈبہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ مَیں نے نشست پانے کی خاطر ہر کونے پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں ایک نشست پر جانی کو بیٹھا دیکھ کر مَیں حیران رہ گیا۔ بلکہ اپنی آنکھوں پر اعتبار ہی نہ آیا۔ وہ پوری کائنات سے بے خبر کتاب پڑھنے میں مگن تھا۔ اُسے ٹیوب سے سفر کرتا دیکھ کر مجھے سخت تعجب ہوا کہ وہ ہمیشہ اپنی کار میں دفتر جایا کرتا تھا۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ اگلے اسٹیشن پر اُس کے ساتھ بیٹھا ہوا انگریز مسافر اُتر گیا اور مَیں جلدی سے خالی نشست کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے وہاں پا کر جانی کو بھی سخت حیرانی ہوئی۔ وہ منہ کھولے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھ کو دیکھتا رہا۔ مَیں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ کوٹ کی جیب میں سے دایاں ہاتھ نکالتے نکالتے رک گیا۔ اُس کا ہاتھ

پلاسٹر نما پٹی میں لپٹا ہوا تھا۔
''کیا ہوا ہاتھ پر؟''
''کچھ نہیں..... معمولی سی چوٹ آئی ہے.... کام پر جا رہے ہو؟''
''ہاں۔تم کو کیسے پتہ چلا کہ میں کام پر جا رہا ہوں؟''
''اتنی صبح تو لوگ کام پر ہی جایا کرتے ہیں۔''
ہم دونوں ہنس دیے۔ وہ شکایت کرنے لگا کہ میں ایک ہی ملاقات کے بعد غائب ہو گیا۔ دوبارہ ملنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی فون پر رابطہ رکھا۔ خیال آیا کہ اُسے دل کھول کر اتنی سناؤں کہ اُس کے ہوش ٹھکانے آجائیں، مگر صبح کا وقت تھا، کیوں اپنا موڈ خراب کیا جائے؟ مگر یہ کہے بنا نہ رہ پایا:
''بدری نارائن جانی۔ زندگی کے سفر میں آدمی سب سے زیادہ اہمیت خود اپنی ذات کو دیتا ہے۔ رشتہ دار، دوست یار، واقف کار سب بعد میں آتے ہیں.... پھر میں تو ٹھہرا پردیسی؟.... کیا خیال ہے تمھارا؟''
میرا سوچا سمجھا طنز اور گہری چوٹ پریشان کن تھی۔ لیکن وہ بجھا بجھا سا نادم، گردن جھکائے اُسے جھیل گیا تھا۔ ایک لمبا سانس بھر کر اُسے باہر چھوڑا اور کتاب کو جھولی میں رکھ کر بایاں ہاتھ چہرے پر پھیرنے لگا۔
گاڑی اپنی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک کے بعد دوسرا اسٹیشن گزر رہا تھا۔ معاً میں بول اُٹھا:
''کیا بات ہے آج تم ٹیوب سے سفر کر رہے ہو؟ تمھاری کار کا کیا ہوا؟''
یہ سننا تھا کہ وہ اتنا گمبھیر ہو گیا کہ مجھے کوئی غیر شخص ہی دِکھائی دیا۔ دُکھ اور افسوس سے بولا:
''اب تم سے کیا چھپانا.... اپنی کار رائٹ آف (WRITE OFF) ہو گئی ہے۔''
''کہیں ایکسیڈنٹ مارا ہے کیا؟''
''ایکسیڈنٹ ہی سمجھ لو.... یہ تو اچھا ہوا کہ میں بچ گیا۔''
اُس کے چہرے پر آتے جاتے رنگ اور ذہنی کیفیت سے عیاں تھا کہ جس کربناک اور تکلیف دہ حادثے سے وہ گزرا ہے اُسے بیان کرے یا نہیں؟ لیکن اگلے پل جب اُس نے مجھے نہایت

چاہت سے دیکھا تو لگا کہ میرا پُرانا جانی میرے برابر بیٹھا ہوا مجھے اپنے دُکھ درد میں شریک ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ دبے دبے کرب سے بولا:

''پچھلے دنوں یہاں نسلی تناؤ بہت زیادہ تھا.... ایک شام، ایک پب (PUB) سے مَیں تھوڑی سی پی کر نکلا تو باہر چھ سات انگریز جوان کھڑے تھے.... انھوں نے مجھے اکیلا دیکھ کر مجھ پر چند جملے کسے .... لیکن میں نے کوئی نوٹس نہ لیا اور سیدھا اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ مگر وہ باز نہ آئے۔ گالی گلوچ پر اُتر آئے۔''

''کیا کہا تھا انھوں نے؟''

''یو پاکی۔ بلیک باسٹرڈ۔ ڈرٹی انڈین۔ کنٹھ .... تمھارے دن پورے ہو گئے ہیں۔ چلے جاؤ یہاں سے ....ورنہ ہم تم کو بھیج دیں گے۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا...مَیں اُن کو بُرا بھلا کہہ کر تیزی سے اپنی کار میں جا بیٹھا اور کار اسٹارٹ کی۔ مگر انھوں نے مجھے کار میں سے باہر کھینچ لیا اور دو تین مجھ پر ٹوٹ پڑے .... اپنے بچاؤ کی خاطر مَیں نے بھی ہاتھ پانو چلائے مگر انھوں نے مجھے خوب پیٹا، خوب مارا۔ باقی لڑکوں نے میری کار کا ستیاناس کر ڈالا۔''

مَیں حادثے کی نوعیت کے بارے میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ انجام کار بول اُٹھا:

''جو بھی ہوا بہت بُرا ہوا۔'' مَیں نے دھیرے دھیرے کہا:

''مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے...مگر ایک بات پوچھوں؟ جواب دو گے؟''

اُس نے ہاں میں گردن ہلا دی۔

''مگر جانی؟ تم کو کیوں مارا پیٹا انھوں نے؟...تم تو برٹش شہری ہو؟ تمھارے پاس برٹش پاسپورٹ ہے؟ اور یہ دیش تمھارا ہے؟''

اُس کے لب کچھ کہنے کو اوپر نیچے ہوئے، مگر وہ اس حالت میں نہ تھے کہ جانی کے الفاظ، خیال اور آواز کا ساتھ دے پاتے۔ پچھتاوے کا احساس اُس کے سارے وجود پر پھیل گیا تھا۔ وہ یکسر بے یار و مددگار دِکھائی دے رہا تھا۔ مَیں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اُس کے شانے پر رکھ دیا۔ ہماری آنکھیں چار ہوئیں تو مَیں نے اپنائیت سے کہا:

''کیوں بھولتے ہو... تمھاری شکل پر اپنے چھوڑے ہوئے دیش کا نام لکھا ہے جو آخری دم تک لکھا رہے گا.... تم اُس سے بھاگ نہیں سکتے؟''
اُس کی گردن جھک کر رہ گئی تھی۔
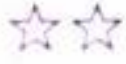
چکرویو

(ایک جنگی حربہ)

کچھ دیر پہلے راکی میرے ساتھ تھا۔ سنجیدہ، اُداس، کھویا کھویا سا۔ دور خلاؤں میں دیکھتا ہوا ہولے ہولے دریائے ٹیمز کے کنارے چل رہا تھا۔ سگریٹ کا دھواں برابر اُس کی انگلیوں کے درمیان سے اُٹھ رہا تھا۔ مختصر سا کش لے کر وہ کچھ دیر کو سگریٹ کو بھول جایا کرتا تھا۔ لیکن سگریٹ متواتر اُس کی انگلیوں میں گھومتا رہتا تھا۔ فضا خاموش تھی۔ صرف پتوں کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ سورج موٹروے کے پُل سے کچھ ہاتھ اوپر کھڑا ڈوبنے کی فکر میں تھا۔ اُس کی مدھم نارنجی روشنی پانی کی سطح پر پھیل کر ایسی دلفریب آگ لگا رہی تھی کہ ایک پل کے لیے مَیں خود کو بھول کر رُک گیا تھا۔ مَیں نے راکی کو بھی اس دل کش منظر کی طرف متوجہ کرنا چاہا مگر اُس نے کوئی دلچسپی ظاہر نہ کی۔ بلکہ جلتی ہوئی سگریٹ پانی پر اُچھال کر آگے بڑھ گیا۔ مَیں جانتا تھا کہ اُس کے باطن میں مہابھارت کا جو یُدھ چھڑا ہوا ہے وہ کس قدر گھمسان، کس قدر شدید ہے کہ وہ اُس سے ہٹ کر نہ تو کچھ دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن مَیں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس یُدھ میں خود ہی کورو ہے اور خود ہی پانڈو۔ اُس نے خود ہی اِن کرداروں کو جنم دیا ہے اور اب وہ ایک دوسرے کا

وجود ختم کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ اگر ابتدا میں راکی نے مجھے سمجھ لیا ہوتا یا میری باتوں کا تھوڑا بھی اثر قبول کیا ہوتا تو آج اُسے کورکھشیتر کے میدان سے گزرنا نہ پڑتا۔ اُسے جذباتی اور ذہنی پریشانی سے دوچار نہ ہونا پڑتا۔ مگر اُن دنوں وہ عقل سے زیادہ دل سے کام لیا کرتا تھا۔ طبیعت بھی باغیانہ تھی۔ زندگی کے بعض اداروں کے خلاف بغاوت پر آمادہ رہتا تھا۔ مَیں نے ہاتھ بڑھا کر دھیرے سے اُس کے کندھے پر رکھ دیا۔ وہ چونک اُٹھا اور مُڑ کر مجھے ڈوبتی ہوئی نظروں سے دیکھا، گویا کسی دوسری دُنیا سے لوٹ آیا ہو۔ قدرے سوچ کر گویا ہوا:

''تم بتاؤ۔ اِن حالات میں مَیں کیا کروں؟''

میرے پاس اُس کے سوال کا جواب ہوتے ہوئے بھی موجود نہ تھا۔ دراصل اُس کی زندگی ایک ایسے خطرناک موڑ پر آن کھڑی ہوئی تھی کہ میرا کوئی بھی صلاح مشورہ اُسے گمراہ کر سکتا تھا، برباد کر سکتا تھا اور مَیں ہرگز اِس کے حق میں نہ تھا کہ وہ بعد ازاں مجھ کو قصوروار ٹھہرائے۔ جب کہ میرے من کی بات لبوں پر آنے کو بے قرار تھی۔ لیکن مَیں نے من کو مارا، زبان پر پہرے بٹھائے اور خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ وہ انتہائی کرب کے ساتھ بولا:

''یہ احساس تو مجھے کھا جائے گا۔ مَیں اس احساس کے ساتھ کیسے زندہ رہ پاؤں گا؟''

مَیں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اُسے پیار سے تھپتھپایا۔ پھر چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سڑک کے موڑ پر درختوں میں گھرا صدیوں پُرانا ٹیوڈر عہد کا پب دِکھائی دیا۔ جس کے بیرونی احاطے میں ہر عمر کے لوگ بیٹھے پی پلا رہے تھے۔ مَیں نے اُس طرف اشارہ کر کے کہا:

''آؤ وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔''

مگر اُس نے زوردار جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ میری آنکھوں سے ہوتا ہوا میری آتما تک اُتر گیا۔ اُس کی سُرخ آنکھیں جواب کی طلب گار تھیں۔ مَیں اُس کا مقابلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ میری گردن کسی حد تک جھکتے ہی اُسے مکمل یقین ہو گیا کہ خاموشی ہی میری زبان ہے اور مَیں کوئی بھی حل تجویز نہیں کر پاؤں گا۔ انتہائی مایوس ہو کر بولا:

''تمھارے پاس بھی میری پرابلم کا حل موجود نہیں ہے؟''

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے سڑک کی طرف بڑھ گیا۔ مَیں نے دو تین بار 'راکی، راکی' پکار کر اُسے روکنا چاہا مگر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا، کاروں کے درمیان سے گزرتا، جان ہتھیلی پر رکھے سڑک کو پار کر گیا اور مَیں دیکھتا ہی رہ گیا۔

مَیں بھاری دل کے ساتھ پب کے ایک روشن گوشے میں بئیر کا گلاس سامنے رکھے، راکیش تھاپر عرف 'راکی' کے متعلق سوچ بچار کر رہا ہوں۔ جو مجھ سے روٹھ کر اور انتہائی مایوس ہو کر چلا گیا ہے۔ وہ میرے اُن بہترین دوستوں میں سے ہے جن کے واسطے مَیں نے آج تک کوئی حسد، نفرت یا رقابت محسوس نہیں کی۔ وہ دہلی یونیورسٹی میں میرے ساتھ ہی پڑھا کرتا تھا۔ چھریرا بدن، صاف رنگ، اُجلے نین نقش اور گہرے کالے بال۔ اُس کے خاندان کا ہر فرد منہ میں سونے چاندی کا چمچہ لیے پیدا ہوا تھا۔ اُس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش چٹکیوں میں پوری کر دی جاتی تھی۔ مگر اُس پر والدین کی کڑی نگاہ ضرور رہا کرتی تھی۔ راکی اس ماحول کا پروردہ تھا۔ اُس کے والد ماجد کا کاروبار کشمیر سے ترچناپلی تک پھیلا ہوا تھا اور وہ اُسے مزید پھیلانے کی فکر میں رہا کرتے تھے۔ راکی نے یونیورسٹی کی تعلیم مکمل کی تو وہ بزنس مینجمنٹ کا کورس کرنے لندن چلا آیا۔ ترقی یافتہ سوسائٹی کے کھلے ماحول میں اُسے ہر طرح کی آزادی میسر ہوئی۔ وہ آزاد تھا اور خود کو اُس پنچھی کی طرح پا رہا تھا جو اپنی مرضی کے مطابق دانہ چگتا ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق پرواز کرتا ہے۔ اُس پر کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی اور وہ مستی کے عالم میں آکاش کی وسعتوں میں اوڈاریاں مارتا پھرتا ہے۔

ایک سرد شام، مَیں خود کو نہایت اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ دیارِ غیر میں اکیلا پن جب آدمی پر سوار ہوتا ہے تو وہ خود سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ کمرے کی دیواریں اُسے خود میں دبوچا کرتی ہیں۔ مَیں بھی اُسی مرحلے سے گزر رہا تھا۔ مَیں راکی کو اطلاع کیے بغیر اُس کے اسٹوڈیو فلیٹ :

گولیسٹر ٹیرس پر پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے وہ گھر پر ہی تھا، مگر اکیلا نہیں تھا۔ مجھ سے مل کر بے حد خوش ہوا تھا۔ سات آٹھ سفید فام جوان لڑکے لڑکیاں بھی کمرے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اُن کی جوان عمریں، اُن کے عامیانہ لباس، لمبے لمبے بے ترتیب بال، اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی کتابیں اور فائلیں اور اُن کا لا اُبالی پن اُن کے اسٹوڈنٹ ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ بیئر کا دور چل رہا تھا۔ راکی ہر کسی سے مذاق کرتا بڑھ چڑھ کر قہقہے لگا رہا تھا۔ اُس کی صحت بھی پہلے سے بہتر ہوگئی تھی۔ سفید گال گلابی مائل ہو گئے تھے اور چہرہ مزید نکھر آیا تھا۔ میں بھی اُن کے ساتھ پیتا پلاتا رہا اور گاہے گاہے اُن کی باتوں میں شرکت کرتا رہا۔ مجھے راکی پر تعجب بھی ہو رہا تھا کہ اُس نے دیکھتے ہی دیکھتے کئی یار دوست بنا لیے ہیں۔ ہر کوئی اُسے پسندیدہ نظروں سے دیکھا کرتا، خاص طور پر کیتھرین، جو راکی کے برابر بیئر کا مگ لیے چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر راکی کو دیکھتے وقت اُس کی آنکھیں روشن ہو جایا کرتیں، جہاں چاہت تھی، اپنائیت تھی، خلوص تھا۔ راکی بھی کم و بیش اُسی کیفیت سے دوچار تھا۔ گمان گزرا کہ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی ہے اور وہ دل لینے دینے کی منزل پر ہیں۔ اتنے میں ایک ہپی نما جوان نے سر سے گالف کیپ اُتار کر دوستوں کے درمیان رکھ کر اعلان کیا کہ ڈنر ٹائم ہو گیا ہے اور وہ فش اینڈ چپز (Fish & Chips) خریدنے کو جا رہا ہے۔ لہٰذا ہر کوئی حسب توفیق کیپ میں رقم ڈال دے۔ چاروں طرف سے پونڈ اور سکے کیپ کی طرف اُچھلنے لگے۔ میں نے بھی پونڈ اور چند سکے اُس میں ڈال دیے۔

زہر ماری کرنے کے بعد اور راکی کے دوستوں کے رخصت ہونے پر، میں اور وہ اکیلے رہ گئے تھے۔ باہر اندھیرا اُتر کر گہرا ہو چکا تھا۔ سردی رفتہ رفتہ بڑھ رہی تھی۔ راکی نے برانڈی کے دو چھوٹے چھوٹے گلاس تیار کیے اور ایک میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے گلاس اپنے قریب رکھ کر دھیرے سے کہا:

''انڈیا لوٹنے پر تم اِن لوگوں کو بہت مِس (MISS) کرو گے؟''

یک بارگی اُس کا چہرہ ماند پڑ گیا۔ سپاٹ، بے رنگ، اُداس، مگر جلد ہی اُس نے خود پر قابو پا لیا:

''یہ سالی بھی ایک مجبوری ہے۔''
سگریٹ کے کش لیتے ہوئے وہ میرے چہرے سے نظریں ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ اُس کے آریائی نقش ونگار سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی نہایت ہی اہم بات کرنے کے موڈ میں ہے۔ اُسے محض صحیح موقع کا انتظار ہے۔ یا وہ اس خیال میں ہے کہ آیا اُسے تسلی بخش جواب ملے گا یا نہیں؟ آخرش بول پڑا:
''تم مجھ سے زیادہ سیانے ہو، میرے ایک سوال کا جواب دو گے؟''
''اگر سوال سمجھ میں آیا تو؟''
ہمارے ہلکے ہلکے قہقہے فضا میں ٹکرائے۔ پھر اُس نے سنجیدگی اختیار کر کے جاننا چاہا:
''اگر کسی شخص کو کوئی جگہ پسند آجائے؟ اُس کا دل بھی وہاں لگ جائے اور اُسے وہاں کے لوگ بھی اچھے لگنے لگیں تو کیا اُسے وہاں رہنے کا ادھیکار نہیں؟''
''ضرور ہے۔ آدمی کو وہیں رہنا چاہیے، جہاں اُس کا دل خوش رہے... مگر یہ سب تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''
اُس نے اپنی کرسی آگے کھسکائی اور رازدارانہ لہجے میں کہا:
''میرا دل یہاں لگ گیا ہے۔ مَیں یہاں کے لوگوں کو پسند کرنے لگا ہوں۔ وہ بڑے پریکٹکل ہیں۔ سیلف میڈ ہیں۔ کسی دوسرے کی زندگی میں دخل نہیں دیتے۔ آپ کچھ بھی کریں، کیسی بھی زندگی جئیں، وہ اپنے کام سے مطلب رکھتے ہیں۔ مگر ہمارا تو چلن ہی نرالا ہے۔''
لگا کہ وہ بہت جلد اپنے دیش کا سماج اور وہاں کا گھٹن زدہ ماحول بیان کرے گا، جس کا مجھے چند روز پہلے تجربہ ہو چکا تھا اور پھر وہی ہوا۔
''وہاں گھر والوں کی پابندیاں، سماج کی بندشیں، عوام کی نکتہ چینی، برادری کے طعنے اور رشتہ داروں کا حسد... مَیں جب وہاں اور یہاں کی سوسائٹی کا مقابلہ کرتا ہوں تو مجھے وہاں کی سوسائٹی بیک ورڈ لگتی ہے۔ بلکہ ہم لوگ آزادی میں یقین ہی نہیں رکھتے اور نہ ہی کسی کو آزاد دیکھ سکتے ہیں... کیا تم کو یہ محسوس نہیں ہوتا؟''
اُس نے ایک ہی سانس میں اپنے معاشرے کے کئی پہلو بے نقاب کر ڈالے تھے۔ یقیناً وہ ایک

لمبے عرصے سے اِن خطوط پر غور و فکر کر رہا تھا۔ لیکن مَیں نے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنا ضروری جانا:

''اس میں شک نہیں کہ یہ ایک آزاد ملک ہے، آزاد معاشرہ ہے۔ یہاں ہر طرح کی جنسی آزادی بھی موجود ہے.... آپ جتنا چاہیں مزے لوٹیں، کوئی روک تھام نہیں .... مگر جہاں تک میرا تعلق ہے، مَیں یہاں کی برادری کی طرف دوستی کا ہاتھ تو بڑھا سکتا ہوں اُن کی طرح زندگی نہیں جی سکتا۔''

اُس کا ردِعمل گہرا تھا۔ کئی سوال اُس کے چہرے پر اُبھر آئے تھے۔ مَیں نے اُسے سمجھانا چاہا:

''ہر ملک کی سوسائٹی دوسرے ملک سے مختلف ہوتی ہے۔ اُس کا اپنا ہی ڈھانچہ، رسم و رواج اور تقاضے ہوتے ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔''

''تو پھر تم کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ہر سوسائٹی کی بنیاد وہاں کے مذہب، اخلاقیات، تعلیم، ورثہ اور عوام کے نظریات پر رکھی جاتی ہے۔''

وہ خاموش مجھے دیکھتا رہا۔ مَیں نے اپنی بات کو آگے بڑھایا:

''چوں کہ ہماری پرورش ایک الگ ماحول، الگ کلچر، الگ سوسائٹی اور اُس کی قدروں کے ساتھ ہوئی ہے۔ لہٰذا ہماری سوچ بھی یہاں کے لوگوں سے مختلف ہے۔''

''تم تو ایک سوشیالوجسٹ کی طرح باتیں کر رہے ہو۔''

''ہاں۔ یہ باتیں یہاں رہ کر میری سمجھ میں آئی ہیں۔ ورنہ مَیں بھی دوسرے ڈھنگ سے سوچا کرتا تھا۔ مگر یہاں رہ کر اب مَیں زیادہ ہی انڈین بن گیا ہوں۔''

''یوں کہو کہ زیادہ ہی ری ایکشنری (رجعت پسند) ہو گئے ہو؟''

اُسے اپنا جملہ اتنا پسند آیا تھا کہ اُس کا قہقہہ کمرے کی دیواروں سے ٹکراتا ہوا میرے وجود پر پھیلتا چلا گیا۔ مجھے اپنے اندر کوئی شے ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مَیں نے قدرے زخمی ہو کر کہا:

''راکی میری ایک بات پلّے سے باندھ لو۔ ہر شے کی اپنی فطری حد ہوا کرتی ہے۔ اگر جنسی اور اخلاقی آزادی غیر فطری بن جائے تو وہ آدمی کی شخصیت میں دراڑیں ڈال کر اُس کی زندگی کو

غارت کر ڈالتی ہے۔''
لیکن میرے خیال کو اُس نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ ایک بے معنی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر کھیلتی رہی جو برملا میری سوچ، میرے خیالات کا مذاق اُڑا رہی تھی۔

اُن دنوں مَیں چارٹرڈ اکاؤنٹس کی ایک معروف فرم میں آرٹیکل شپ کر رہا تھا۔ فرم یہودیوں کی تھی۔ وہ مجھے اُتنا ہی معاوضہ دیا کرتے تھے جس سے میری گزر بسر مشکل سے ہوا کرتی تھی۔ کام بھی اتنا سونپا کرتے کہ میرے دماغ کی چولیں ڈھیلی ہو جاتیں۔ ایک سفید فام واقف کار کے نیک مشورے سے مَیں نے ایک انڈین ریسٹورنٹ میں شام کے وقت بطور پورٹر جز وقتی کام شروع کر دیا تھا۔ وہاں چند پیسوں کے علاوہ مجھے سب سے بڑا لالچ انڈین فوڈ کا بھی تھا۔ گو کہ کام بڑا سخت تھا۔ مجھے پلیٹیں دھونا پڑتی تھیں، پتیلے مانجھنے پڑتے تھے۔ رَبش بن خالی کرنے پڑتے تھے۔ مگر مَیں پھر بھی خوش تھا کہ اپنا کھانا پیٹ بھر کر نصیب ہوا کرتا تھا۔ پردیس میں ایک مجرد کے لیے یہ بہت بڑا آسرا تھا۔ راکی اپنی ہی دُنیا میں مست تھا۔ اُس کی نئی دُنیا میں نئے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔ اُن میں جوان، نازک، سڈول بدن بھی شامل تھے اور وہ اُن میں راجا اندر بنا بیٹھا تھا۔ اُس کا اُٹھنا بیٹھنا، گھومنا پھرنا زیادہ تر اُن ہی کے ساتھ رہا کرتا۔ اُسے یہاں کی آزاد، رنگین اور تیز گام زندگی اتنی راس آ چکی تھی کہ وہ اُس کا تہذیبی رنگ بھی تیزی سے قبول کر رہا تھا۔ اس کا احساس مجھے اُس شام ہوا جب وہ ایک لمبے عرصے کے بعد غیر متوقع طور پر میرے دفتر میں چلا آیا تھا۔ چند گلے شکوے اور گالیاں لینے دینے کے بعد ہم ریجنٹ اسٹریٹ کے ریسٹورنٹ فور سیزنز میں چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے پُرانی یادوں کو تازہ کر رہے تھے۔ شام کا دھندلکا رات کی تاریکی میں تحلیل ہو رہا تھا اور مجھے کچھ دیر میں ریسٹورنٹ جانا تھا۔ مَیں نے سرسری طور پر راکی سے جاننا چاہا کہ آج شام اُس کا پروگرام کیا ہے؟ ایک نظر گھڑی پر ڈال کر وہ مسکرا دیا۔ مسکراہٹ میں فاتحانہ غرور تھا۔ بولا:
''کیتھرین آنے والی ہے۔''

اُس کا نام لیتے ہوئے اُس کے لب، نتھنے اور آنکھیں مسکرا اُٹھیں۔ گویا کیتھرین ہی اُس کی زندگی کا محور ہو۔ اُس کے بنا وہ جینے کا تصور بھی نہ کر سکتا ہو۔ گوش گزار ہوا:

''ظاہر ہے شام تو کسی پب میں گزرے گی۔ کھانا باہر کہیں کھا کر اگر جیب نے اجازت دی تو کوئی مووی (MOVIE) دیکھ لیں گے یا ممکن ہے کچھ دیر کے لیے نائٹ کلب میں چلے جائیں ... پھر کیتھرین رات میرے ہاں ٹھہر جائے گی یا مَیں اُس کے ہاں شب باشی کروں گا۔''

''تم تو واقعی انگریز بن گئے ہو... بالکل اُن کی طرح زندگی جی رہے ہو؟''

''اس میں حرج ہی کیا ہے... اب مجھے یہیں رہنا ہے۔ پھر ایک شخص کو جہاں رہنا ہو اُسے وہاں کی زندگی بھی اپنانی چاہیے۔ DO AS THE ROMANS DO''

''تو کیا تم نے یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''

''ہاں''

یہ صدمہ میرے لیے اتنا گہرا تھا کہ مَیں حواس باختہ اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ اُس پل مجھے اپنا بھی خیال آیا کہ ایک مَیں ہوں جسے شدت سے اُس دن کا انتظار ہے کہ کب اُس کے آرٹیکل ختم ہوں اور وہ پہلا جہاز پکڑ کر انڈیا پہنچے۔ تا کہ گھر والوں سے، رشتہ داروں سے اور یار دوستوں سے لپٹ لپٹ کر انھیں بتائے کہ وہ کیوں کر اُن کی کمی کو محسوس کرتا رہا ہے۔ لیکن دوسری طرف راکی ہے جو سب کچھ تیاگ کر ایک بے گانے دیس کو، ایک پرائی دھرتی کو اپنانے کی سوچ بیٹھا ہے۔ مجھے گہری فکر میں ڈوبا دیکھ کر وہ بول اُٹھا:

''شاید تم اِس سوچ میں ہو کہ یہ قدم اُٹھا کر مَیں غلطی پر ہوں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔''

میری حیرت جوں کی توں برقرار رہی۔

''اس سوسائٹی نے مجھے زندگی اور دُنیا کو ایک الگ زاویے سے دیکھنے پر مجبور کیا ہے۔ بہت سی باتیں جب میری سمجھ میں آ گئیں تو میرے ہاں یہ احساس پیدا ہوا کہ مَیں بذاتِ خود کیا ہوں؟ کون ہوں اور میری اصلیت کیا ہے؟ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس سوسائٹی نے میری زندگی کو نئے معنی دیے ہیں۔''

''معنی؟ کیسے معنی؟''

''میں جب تک اپنے دیش میں تھا تو لوگ باگ مجھے میرے والدین کی دولت، شہرت، عزت اور اُن کے بزنس کے حوالے سے جانا کرتے تھے۔ اُن کے نام سے پہچانتے تھے، جیسے میرا اپنا کوئی وجود ہی نہ ہو.... مگر اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ کوئی مجھے اُس نظر سے دیکھے۔ میری اپنی بھی تو کوئی شناخت ہے؟ پہچان ہے؟ شخصیت ہے؟''

''ہاں، ہے تو سہی۔ مگر تم یہاں رہ کر کیا کرو گے؟''

''کوئی بھی کام کروں گا۔ بزنس کروں گا۔ اپنی زندگی خود بناؤں گا۔ اُسے نئے معنی دوں گا۔''

اُس کی آواز میں خود اعتمادی کے ساتھ بلا کی تلخی بھی موجود تھی۔ مَیں محسوس کر رہا تھا کہ اُس تلخی کے پیچھے چھپی ہوئی گھٹن کب، کہاں اور کن حالات میں پیدا ہوئی ہے، جو نفرت کا روپ دھار کر ایک نئے جذبے کو جنم دے بیٹھی ہے۔ اُس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ کر مَیں نے گفتگو کو نیا موڑ دینا چاہا:

''چاہو تو اس جذبے کو اپنے دیش میں بھی عملی شکل دے سکتے ہو؟''

''وہاں یہ ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''جو آزادی مجھے یہاں مل رہی ہے مَیں اُس کا تصور بھی وہاں نہیں کر سکتا...وہ سوسائٹی بڑی گھٹن زدہ، بڑی گھٹیا...''

وہ کہتے کہتے اچانک رُک گیا۔ کیتھرین ریسٹورنٹ میں داخل ہو چکی تھی۔ اُس نے جھک کر راکی کے ہونٹوں کو چھوا۔ پھر مجھ سے ہاتھ ملا کر راکی کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ نکلتا قد، متوازن جسم، پُرکشش چہرہ، بدن کی رنگت نیم سنہری، نیم سفید، اپنی طرف کو کھینچتی ہوئی۔ سگریٹ سلگا کر اُس نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے میرا جائزہ لینا چاہا۔ مَیں جانتا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ مَیں راکی کا واحد ہندوستانی دوست جو ٹھہرا تھا، جو اُس کی شخصیت کے ساتھ اُس کے خاندانی پس منظر سے بھی واقف تھا ممکن ہے مستقبل میں اُسے راکی کے حوالے سے کبھی میری ضرورت محسوس ہو؟ کرائسس (CRISIS) تو ہر کسی کی زندگی میں جلد یا بدیر پیدا ہوا ہی کرتے ہیں۔ پھر ہمارے دُکھ سُکھ بھی تو

دوسروں سے وابستہ ہوتے ہیں، جن سے مفر ممکن نہیں۔
کیتھرین نے مجھے بھی پب میں چلنے کی دعوت دی، لیکن میں نے اپنی مجبوریاں بیان کیں کہ مجھے وقت پر ریسٹورنٹ پہنچنا ہے۔ اُس پر وہ شائستگی سے بولی:
''تمھیں کچن میں پورٹر کا کام کرتے ہوئے شرم تو محسوس نہیں ہوتی؟''
میں قدرے جھینپ گیا تھا اور سر کھجا کر جواب دینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ راکی بول اُٹھا:
''اس میں شرم کیسی؟ یہاں تو DIGNITY OF LABOUR ہے۔ ہر کام کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یہ اپنا دیش تھوڑے ہی ہے جہاں ایسا کام کرنے والوں کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ جیسے وہ انسان نہ ہوں۔ وقت کی گرد ہوں۔''
راکی کی نس نس میں اپنے معاشرے، اپنے نظام کی خاطر زہر اُتر چکا تھا۔ میرے نزدیک وہ یقیناً خود سے بھاگ کر راہِ فرار اختیار کر رہا تھا۔ محض کیتھرین کی خاطر، جو اُس کے دل و دماغ پر یوں چھا چکی تھی کہ اُسے بھری پُری دُنیا میں کیتھرین کے سوا کچھ دِکھائی نہیں دے رہا تھا۔

وہ کیتھرین کی محبت میں اس حد تک ڈوب چکا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ تادمِ آخر چلنے کا آرزومند تھا۔ اُس نے کیتھرین سے جب اپنی طاقت ور خواہش کا اظہار کیا تو وہ ایک لمبی سوچ میں گم ہوگئی تھی مگر اگلے ہی روز اپنا سامان اُٹھا کر اُس کے اسٹوڈیو فلیٹ میں رہنے کو چلی آئی تھی۔ یہ جاننے کی خاطر کہ وہ چند ماہ اکٹھے رہ کر ایک دوسرے کو مزید جان کر انکار یا اقرار میں کوئی فیصلہ کر پائے۔ راکی بے پناہ خوش تھا کہ اُس کی دلی خواہش مکمل ہونے کو جا رہی تھی۔ کیتھرین نے جلد ہی بھانپ لیا تھا کہ راکی نے دُنیا کو اُس کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا ہے۔ وہ یہاں کا تہذیبی رنگ بھی تیزی سے قبول کیے جا رہا ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ وہ تاحیات محبت کرنے والا شوہر، وفادار دوست اور شفیق باپ بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

راکی خود میں مست، خوش گوار مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر اُس کے خوابوں سے

کچھ دور اُس کے والدین چائناوال کی طرح کھڑے تھے۔ بزرگوار نے کھلے الفاظ میں اُسے تنبیہ کر دی تھی کہ اگر اُس نے اپنی ذات برادری یا اپنے مذہب سے باہر بیاہ شادی کی تو اُسے جائداد سے عاق کر دیا جائے گا اور اُس کا اپنے خاندان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ راکی کے لیے یہ صدمہ جان لیوا تھا۔ وہ دنوں، بلکہ ہفتوں پریشان رہا تھا۔ مگر اُس کے ارادے جوں کے توں برقرار رہے اور اُس نے تیسویں روز شادی کر کے اپنی بغاوت کا مکمل ثبوت دے ڈالا تھا۔ میں بھی شادی پر مدعو تھا۔ راکی اور کیتھرین کے تمام قریبی یار دوست رجسٹرار کے دفتر میں موجود تھے۔ لیکن میں نے ہی بیسٹ مین (BEST MAN) کے فرائض انجام دیے تھے۔ میرج سرٹیفکٹ حاصل کرنے پر جب میں نے راکی سے بغلگیر ہو کر اُسے مبارکباد دینا چاہی تو وہ مجھے بھیڑ سے الگ کر کے ایک طرف لے گیا تھا۔ اُس کی آواز میں بلا کا عزم تھا۔ بولا:

''سنو گوسوامی، آج میں ایک نئی زندگی کی شروعات کر رہا ہوں۔ میرا ماضی میرے لیے مر چکا ہے۔ آئندہ بھول کر بھی مجھے اُس کی یاد مت دلانا۔''

یہ کہہ کر وہ کیتھرین کی طرف بڑھ گیا تھا جو شادی کا سفید لباس سنبھالتی، اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں میں کھڑی چہک رہی تھی۔ لیکن میں وہیں کھڑا سوچتا رہ گیا تھا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ آدمی اپنے ماضی سے رشتہ کاٹ کر اُس سے آنکھیں چرا لے؟ جب کہ ہمارا ماضی ہماری جڑوں کو اپنے ساتھ لیے ہمارے پیچھے پیچھے ایک بالک کی طرح چلتا رہتا ہے۔ ہم اُس سے کتنا بھی دور بھاگیں وہ بالک بڑھ کر ہماری انگلی تھام لیتا ہے اور ہمیں ماضی میں جھانکنے پر مجبور کرتا ہے۔

راکی نے ڈگری حاصل کی تو ایک معروف کمپنی میں ملازمت بازو پھیلائے اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ کیتھرین تو پہلے ہی سے ایک بینک میں باوقار عہدے پر فائز تھی۔ ہر خاتون کی طرح اُس کے ہاں بھی اپنا گھر بسانے، بنانے اور سنوارنے کی تڑپ موجود تھی۔ شہر کے ایک قیمتی علاقے میں ایک کشادہ گراؤنڈ فلور فلیٹ خرید کر وہ اور راکی اُس کی اعلیٰ آرائش میں جُٹ گئے تھے۔ اُن کی معاشی ذمہ داریاں ضرور بڑھ گئی تھیں مگر اُن کی لائف اسٹائل میں زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔

وہی پارٹیاں، ریستوراں، لیٹ نائٹ فلم شو، وڈیو سیشن اور لانگ ڈرائیو۔ راکی نے مجھے بھی ان ہنگاموں میں شامل ہونے کی بارہا دعوت دی تھی۔ لیکن میں ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر اُس سے الگ ہی رہا۔ درحقیقت اس نوعیت کے پروگرام میرے مزاج سے میل نہیں کھاتے تھے۔ مگر مَیں انھیں بُرا بھی نہیں سمجھتا تھا کہ وہ مغربی طرزِ زندگی کے اہم جُز تھے۔ راکی میرے انکار پر جھنجھلا اُٹھا کرتا:

''یار گوسوامی، تم سالے کمال کی چیز ہو۔ جنت میں رہ کر بھی پنڈت کے پنڈت ہی رہے۔''

اُس کی کاٹ دار ہنسی میں میری ہنسی بھی شامل ہو جایا کرتی، لیکن ایک دفعہ مَیں اُس کی پکڑ میں آ ہی گیا تھا جب اُن کی شادی کی سالگرہ تھی، راکی کا دلی اصرار تھا کہ میں اس موقع پر ضرور آؤں اور اس موقع پر رات بھی وہیں بسر کروں۔ میرے آگے جھجک کی مضبوط دیوار سدا سے کھڑی تھی۔ اُسے مَیں پھلانگ تو سکتا تھا، توڑ نہیں سکتا تھا۔ مَیں اسی پس و پیش میں تھا کہ راکی نے قدرے جذباتی ہو کر کہا تھا:

''یقین کرو اپنی زبان میں کسی سے بات کیے ہوئے عرصہ ہو گیا ہے۔ تم آؤ گے تو پیاس کچھ تو بجھے گی؟''

اور مَیں واقعی انکار کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

مَیں ہیم اسٹیڈ انڈر گراؤنڈ اسٹیشن سے نکل کر چڑھائی چڑھتا ہوا، راکی کے فلیٹ گرین ڈرائیو وے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ پت جھڑ کا موسم دبے پانو وارد ہو چکا تھا زرد، خشک، بے جان پتے پیڑوں کی شاخوں کو چھوڑ کر سڑک کے کنارے پھیل رہے تھے۔ مَیں ہاتھوں میں تحفہ اور گلدستہ سنبھالے پیڑوں کی قطار تلے سے گزرتا، تاحدِ نظر پھیلے ہوئے پتوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اُجلے مکانوں کے آگے روٹھے ہوئے بڑے حسین لگ رہے تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ اندھیرا ہونے تک وہیں کھڑا رہوں اور پتوں کے ٹوٹنے، گرنے اور پھیلنے کا منظر اپنی آنکھوں میں قید کر لوں۔

فلیٹ کا دروازہ نیم وا تھا۔ مَیں نے اُسے ہلکا سا سرکایا تو اندر کافی چہل پہل تھی۔ ہال میں چند سفید، سیاہ اور سانولے چہرے ہاتھوں میں گلاس تھامے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ دائیں ہاتھ پر پھیلے ہوئے لاؤنج میں مہمان نیم دائرہ بنائے طرح طرح کے مشروب پی رہے تھے۔ کیتھرین بھی اُن میں شامل تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ مہمانوں کو چھوڑ کر بھری مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف بڑھ آئی تھی۔ ہلکے سبز رنگ کا لباس اُس کے بھرے بھرے بدن پر قیامت ڈھا رہا تھا۔ ایک پل کو مجھے خیال آیا کہ اگر راکی نے اس عورت کی خاطر دُنیا تج دی ہے تو کیا بُرا کیا ہے؟ اُس کے حسن کے آگے تو ایمان بھی ڈگمگا جائے۔ اُس نے میرے ہاتھوں سے سامان لے کر مصنوعی خفگی کا اظہار کیا:

''تمھیں اتنا کچھ لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ تمھارا آنا ہی کافی تھا.... خیر تمھارا بہت بہت شکریہ۔ آؤ تمھیں راکی سے ملواؤں۔''

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر لاؤنج کے وسط میں لے آئی تھی۔ پھر مجھے وہیں چھوڑ کر کمرے کے پیچھے مختصر سے باغیچے کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں بھی کچھ مہمان کھڑے تھے۔ جدید فرنیچر سے آراستہ لاؤنج بڑا ہی صاف ستھرا تھا۔ میرے اردگرد پھیلے ہوئے چہروں میں کوئی بھی چہرہ ایسا نہ تھا جسے مَیں نے پہلے بھی راکی اور کیتھرین کی صحبت میں دیکھ رکھا تھا۔ کلاس کے بدلتے ہی سرکل بھی بدل گیا تھا۔ چہرے بھی بدل گئے تھے۔ اُن کے بیش بہا لباس دیکھ کر مَیں خود کو کم تر محسوس کر رہا تھا اور بار بار اپنے لباس پر نظر ڈال رہا تھا۔ راکی گارڈن سے بازو پھیلائے میری طرف بڑھا اور دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گیا تھا۔ اُس کے ہاتھوں کی انگلیاں میرے بدن میں دھنسی جا رہی تھیں۔ لگا کہ راکی اپنی برادری سے بچھڑ کر بہت ہی اکیلا ہو گیا ہے اور وہ اپنے چھوڑے ہوئے دیش کو مجھ میں تلاش کر رہا ہے۔

فلیٹ کا ہر کونہ، ہر حصہ اتنی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا کہ ہر شے اپنی جگہ پر لب ہلاتے ہوئے محسوس ہو رہی تھی۔ راکی کے ہمراہ مَیں اُن کے بیڈ روم میں داخل ہوا تو دیواروں پر برہنہ اور نیم برہنہ تصویریں دیکھ کر مَیں سرد پڑ گیا تھا۔ الغرض وہ بیڈ روم کم تھا، نیوڈ گیلری زیادہ تھی۔ مَیں حیرت کا مارا پوچھے بغیر نہ رہ پایا:

''یہ سب کیا ہے؟''

''تصویریں۔''

مگر ان کا یہاں کیا کام؟...تم دونوں تو ابھی کافی جوان ہو؟''

وہ ہنس دیا۔ دھیرج سے بولا:

''نارمل زندگی گزارنے کی خاطر سیکس بہت ضروری ہے .... یہ تصویریں صحت مند غذا کی طرح ہیں۔ گاہے گاہے متاثر کرتی رہتی ہیں۔''

لیکن میرے ذہن نے اُس کی ہر دلیل کو غیر منطقی جان کر رد کر ڈالا تھا۔

پارٹی میں پینے پلانے کا سلسلہ زور پکڑ چکا تھا۔ سبھی اتنی مقدار میں پی چکے تھے کہ مردوں کی آنکھوں میں عورتیں سراپا گھومنے لگی تھیں اور عورتیں بھی اپنے خول سے نکل کر اِدھر اُدھر جھانکنے لگی تھیں۔ پسند اور ناپسند کی فضا تیار ہو رہی تھی۔ انشورنس بروکر مارک اپنی دُبلی پتلی بیوی کے ساتھ لگ کر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ چور نظروں سے کیتھرین کو اس انداز دیکھتا کہ اُس کے چہرے بُشرے سے واضح تھا کہ وہ ازل سے پیاسا ہے اور پیاسا ہی مرے گا۔ مگر ہونہار کیتھرین مارک کو ذرا بھی خاطر میں نہ لا رہی تھی۔ اُچٹتی سی نگاہ اُس پر ڈال کر مہمانوں میں کھو جایا کرتی۔ لیکن مارک بھی زمانہ ساز تھا۔ فضا میں کوئی پھڑکتا ہوا جملہ پھینک کر کیتھرین کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا۔ یوں تو میں را کی کے ساتھ ہم کلام تھا، لیکن میرے کان، میری سمجھ اور میری آنکھیں بظاہر تماشے میں شریک تھیں۔

مہمانوں نے کچھ اس طرح کے کھلے مذاق اور فحش لطیفے سنانا شروع کر دیے تھے کہ ہر کوئی اُن سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ پھر صاحبۂ خانہ کیوں کر پیچھے رہتیں؟ ہر کوئی اپنا گلاس چھوڑ کر اُس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اُس نے محفل کو مزید گرمانے کی خاطر ایک لطیفہ سنایا کہ ایک مسلم لڑکی ایک جاپانی لڑکے سے عشق کر بیٹھی۔ دونوں شادی کے لیے رضامند ہو گئے۔ مگر لڑکی کے باپ نے شادی کے لیے دو شرطیں رکھیں کہ پہلے تو لڑکے کو اسلام قبول کرنا ہو گا اور پھر ختنہ بھی کروانا ہو گا۔ لڑکا پہلی شرط تو ہنستے ہنستے مان گیا مگر دوسری شرط سن کر بول اُٹھا کہ اگر اُس نے ختنہ کروا لیا تو

پھر وہاں بچے گا کیا؟ اس پر وہ قہقہے پھوٹے کہ بس خدا کی پناہ۔ مہمان کیتھرین کی تعریف کر رہے تھے کہ وہ نہایت خوش طبع، خوش مزاج اور بے باک میزبان ہے۔ مجھ پر چھایا ہوا نشہ رفتہ رفتہ کم ہوا جا رہا تھا۔ مَیں حیرت کا مارا گہری سوچ میں گم تھا کہ یا تو مَیں اول درجے کا دقیانوسی شخص ہوں یا کسی دوسری دُنیا کا بندہ ہوں۔ جہاں کی اخلاقیات، اقدار مجھ کو اِس ماحول کا حصہ بننے کی اجازت نہیں دیتی۔ مَیں نے اپنی ذات اور اپنے براہمن پن کو کوستے ہوئے ایک نظر راکی پر ڈالی۔ وہ بھی اوروں کی طرح خوش تھا اور اپنی بیوی کی ظرافت پر نازاں تھا۔ مارک کا تو بُرا حال تھا۔ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ لیکن میرے نزدیک اُس کی ہنسی یکسر مصنوعی تھی، کھوکھلی تھی۔ وہ محض کیتھرین کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر زبردستی ہنسے جا رہا تھا۔

سبھی مہمان فرداً فرداً رخصت ہو گئے تھے، سوائے میرے، مارک اور اُس کی دھان پان بیوی کے۔ کیتھرین کے ہلکے سے اصرار پر وہ لوگ خوشی خوشی فلم ''سکِن گیم'' (SKIN GAME) دیکھنے کو رُک گئے تھے اور مجھے تو حسبِ وعدہ رات وہیں بسر کرنی تھی۔ لاؤنج میں لیمپ اسٹینڈ کی کمزور روشنی میں راکی اور کیتھرین لکیوئر (LIQUEUR) کے مخصوص گلاس تھامے صوفے پر بیٹھے تھے۔ دوسری طرف مارک اور اُس کی بیوی تھی اور مَیں اِن سب کے درمیان چھوٹے صوفے پر بیٹھا ٹیلی وژن دیکھ رہا تھا۔ کیتھرین نے ریموٹ کنٹرول اُٹھا کر چینل بدلا تو ڈی وی ڈی شروع ہو گئی۔

''سکِن گیم'' کا پہلا منظر یوں تھا کہ اسکرین پر ایک جوان جوڑا سر جوڑے، گہری مستی میں ڈوبا کھڑا تھا۔ فوٹو گرافر نے نیم تاریک نیم اُجالے میں رومانی ماحول تیار کر رکھا تھا۔ جوان جوڑا بے حس و حرکت تھا۔ کبھی کبھار اُن میں ایک اپنی ناک دوسرے کی ناک سے رگڑ کر آنکھیں موند لیتا۔ لیکن کیمرہ جوں ہی پیچھے کی طرف ہٹا تو اُن کے برہنہ بدن سر سے پا تک دِکھائی دیے۔ کچھ دیر دونوں ساکت کھڑے رہے۔ لگا کہ کسی بُت تراش نے کمرے کے وسط میں سنہری مائل مجسمے نصب کر دیے ہیں اور وہ صدیوں اسی عالم میں کھڑے رہیں گے۔ لیکن یکبارگی مجسموں میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ جاگ اُٹھے۔ جوان بدن اپنے ہاتھوں، ہونٹوں اور دانتوں سے باتیں کرنے لگے۔ لمحہ

لمحہ اُن کی حرکات اتنی تیز ہوتی چلی گئیں کہ اُن کے بدنوں پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اُبھر آئیں۔ سانسیں اُکھڑنے لگیں اور جب اُن کا خون لاوا بن کر اُن کی آنکھوں میں اُمڈ آیا تو اُس جوان نے ایک ہی جھٹکے سے لڑکی کو اپنے مضبوط بازوؤں میں اُٹھالیا اور اُسے پلنگ پر پٹک کر اُس کے بدن پر اپنی زبان کی چھاپ چھوڑنے لگا۔ مجھے زبردست جھٹکا لگا۔ میرے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا تھا اور آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ لیکن میرے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے کردار نہایت اطمینان سے فلم کا نظارہ کر رہے تھے۔ اُن پر ردِعمل اتنا گہرا نہ ہوا تھا۔ البتہ راکی نے ہاتھ بڑھا کر کیتھرین کو اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا مگر اُس نے بڑے چاؤ سے اُس کا ہاتھ پرے کر دیا تھا۔ زبان کا کھیل الگ الگ رنگ دِکھا رہا تھا۔ اُس نے لڑکی کو ایسی دُنیا میں پہنچا دیا تھا جہاں اُسے بے نام سی خوشی، بے نام سی لذت حاصل ہو رہی تھی اور وہ خود کو مکمل فراموش کیے بیٹھی تھی۔ میری رگوں میں خون اتنی تیزی سے گردش کر رہا تھا کہ میرے سینے میں چیونٹیوں نے منہ کھول ڈالا تھا۔ میں ایک ران پر دوسری ران رکھے پہلو بدل رہا تھا۔ مگر میرے اردگرد بیٹھے ہوؤں کی حالت مجھ جیسی غیر نہ تھی۔ میری حالت یہ تھی کہ مَیں پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا اور ایکسکیوز می (EXCUSE ME) کہہ کر دبے پاؤں کمرے سے چل دیا، مگر ٹھیک اُس پل ایک نسوانی قہقہہ اُبھرا اور وہ خاموش فضا میں تب تک میرا پیچھا کرتا رہا جب تک کہ مَیں باتھ روم میں داخل نہیں ہو گیا۔

اِس مہانگر کی ایک خوبی یہ بھی رہی ہے کہ یہاں وقت ایک پرندے کی مانند عوام کے سروں پر سے کب، کہاں اور کیسے گزر جاتا ہے، کسی کو احساس تک نہیں ہوتا۔ لیکن جب کوئی شخص فرصت میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے تو اُسے 'وقت' اپنے دامن میں کئی ہفتے، مہینے اور سال سمیٹے کھڑا دِکھائی دیتا ہے۔ میرے آرٹیکل ختم ہو چکے تھے۔ پارٹ سیکنڈ کا نتیجہ عنقریب تھا۔ میرا انگ انگ خوش تھا کہ گھر لوٹنے کے دن نزدیک آ رہے ہیں۔ گھر والوں کے چہرے، اُن کی یادیں، اُن کی محبت تواتر سے اپنی طرف کھینچا کرتی تھی۔ راکی کے متعلق مَیں بس اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ اسی شہر

میں مقیم ہے اور اپنی ماڈرن وائف کے ساتھ خوش ہے۔ ورنہ ہم اپنے اپنے جہاں میں کھو چکے تھے۔ مَیں نہیں جانتا تھا کہ اس دوران میں راکی کی سرگرمیاں کیا رہیں؟ حالات کیا رہے اور کوئی اہم تبدیلی رونما ہوئی یا نہیں؟ اُسے بھی کوئی علم نہ تھا کہ زمانے نے میرے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے؟ دراصل مجھے اُس انوکھی شام دل کی گہرائیوں سے احساس ہو گیا تھا کہ مَیں اور راکی ماضی میں ضرور دوست رہے تھے مگر حال میں ہماری دُنیائیں مختلف ہو چکی ہیں۔ اُس کی دُنیا میں آزادی کا جو تصور ہے وہ اخلاقی بنیاد کو اتنا کمزور بنا دیتا ہے کہ شریف سے شریف شخص بھی آسانی سے پھسل کر اپنے کردار سے بے کردار ہو جاتا ہے اور تمام عمر اُن ہی خطوط پر چلتا نظر آتا ہے۔ راکی کے متعلق مجھے اندیشہ بھی رہا کرتا کہ کہیں وہ کسی گہرے گڑھے میں گر کر نہ رہ جائے؟ جہاں سے نکلنا اُس کے واسطے نہایت مشکل ہو۔

اور آج مَیں تیسرے پہر ہائی اسٹریٹ سے شاپنگ کر کے گھر لوٹا تو لاؤنج میں راکی بیٹھا میرا انتظار کر رہا تھا۔ ایک پل کو مَیں اُسے پہچان ہی نہ پایا۔ دو تین روز کی بڑھی ہوئی داڑھی۔ فکر مند چہرہ، پریشان بال، قمیص کے بٹن کھلے ہوئے، ایک کالر کوٹ کے اندر تو دوسرا باہر۔ آنکھیں چار ہوئیں تو اُس کے قدم بھی میرے قدموں کے ساتھ میرے کمرے کی طرف اُٹھ گئے۔ آٹھ بائی دس فٹ کے کمرے کی اکلوتی کرسی پر وہ اُس جواری کی طرح بیٹھ گیا جو اپنے جیون کا کُل سرمایہ داؤ پر لگا کر بازی ہار چکا ہو اور اب اُسے اپنے کسی مخلص دوست کے کندھے کی سخت ضرورت ہو۔ مَیں خوش تھا کہ بعد مدت کے اُسے میری ضرورت آن پڑی ہے۔ مگر یہ خیال بھی میری سوچ پر بھاری تھا کہ اچانک وہ میرے ہاں آج کیوں چلا آیا ہے؟ کہیں کیتھرین کے ساتھ اُس کی سنجیدہ اَن بن تو نہیں ہو گئی؟ یا بیک ہوم کوئی اچانک تو نہیں چل بسا؟ میری پیشانی پر اُبھرتی ہوئی لکیروں کو دیکھ کر وہ خود ہی بول اُٹھا:

''عجیب چکرویو میں پھنس گیا ہوں''

''چکرویو....؟''

''ہاں۔ سمجھ میں نہیں آتا وہاں سے نکلوں کیسے؟''

پھر اُس نے سگریٹ سلگا کر زیرِ لب کہا۔ گویا خود سے ہم کلام ہو:

''چکرویو سے تو ویرابھیمنیو بھی نہیں نکل پایا تھا، بلا میں کیا چیز ہوں؟''

''ایسا نہ کہو۔ مہابھارت یدھ کا زمانہ تین ہزار پانچ سو ورش پہلے کا تھا۔ آج ہم ماڈرن ورلڈ میں سانس لے رہے ہیں۔ کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی.... ماناویرابھیمنیو اپنی ماں سبھدرا کے گربھ میں اپنے سورما پتا ارجن کی باتیں سن رہا تھا کہ چکرویو کو توڑ کر اندر کیسے گھسا جاتا ہے اور شتروؤں کو نشٹ کیسے کیا جاتا ہے؟ مگر وہ چکرویو سے نکلنے کا طریقہ نہ سن پایا تھا۔''

''ہاں یہ اُس کی ٹریجڈی تھی.... اور وہ یدھ کے تیرہویں روز دشمنوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ پر مجھے تو کیتھی (کیتھرین) نے پہلے روز ہی مار ڈالا تھا، جب اُس نے مجھ کو سمجھوتہ کرنے پر مجبور کیا تھا؟''

''سمجھوتہ؟''

''ہاں''

اُس کی آواز میں بلا کا درد تھا، جو مجھے اندر باہر سے کاٹتا چلا گیا۔ یقین ہو گیا کہ میاں بیوی کے درمیان گہرا بحران راہ پاچکا ہے۔ مَیں نے دھیرے سے پوچھا:

''کیتھرین تو خیریت سے ہے نا؟''

مجھ سے آنکھیں ملائے بنا ہی وہ کھڑا ہو گیا۔ ایک دو قدم اُٹھانے پر اُسے کمرے کی تنگی کا احساس ہوا۔ چاروناچار کرسی پر پھر سے بیٹھ گیا۔ بے بسی کے عالم میں اُس نے فضا میں ہاتھ لہرائے۔ پھر زخم خوردہ لہجے میں بول اُٹھا:

''جانے یہ سلسلہ کب سے جاری تھا۔ پر مجھے کچھ کچھ شبہ ضرور تھا۔ کچھ دنوں سے وہ بدلی بدلی سی نظر آرہی تھی۔ لگتا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے... ایک شام مَیں کام سے لوٹا تو کیتھی نے مجھ سے کہا۔ راکی مجھے تم سے کچھ کہنا ہے.... شاور لے کر اور تازہ دم ہو کر جب مَیں کیتھی کے سامنے آن بیٹھا تو اُس نے اپنی ڈرنک اُٹھا کر ایک دو گھونٹ بھرے اور بولی۔ راکی تم میرے دل، دماغ اور سوچ سے خوب خوب واقف ہو۔ مَیں نے آج تک تم سے کچھ نہ چھپایا، نہ اپنے ضمیر کے خلاف

کوئی دن گزارا۔''

اتنا کہہ کر وہ چند پل کے لیے خاموش ہو گیا تھا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا:

''پیارے گوسوامی۔ یقین کرو میں مکمل طور پر بوکھلا چکا تھا۔ سمجھ سے بالاتر تھا کہ اُس کی باتوں میں کیا پوشیدہ ہے؟ وہ مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے؟ میں نے بھی اپنا گلاس اُٹھا کر چند گھونٹ بھرے مگر خاموش اپنی بیوی کو دیکھتا رہا۔ وہ خود ہی بول اُٹھی:

''راکی۔ ان دنوں میں کسی شخص کو قریب سے جاننے کے مرحلے سے گزر رہی ہوں... میں اُس کے ساتھ باہر بھی جا رہی ہوں... اور میں اُس کو پسند بھی کرنے لگی ہوں۔''

''یہ سننا تھا کہ میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ گلاس سامنے کی دیوار پر پھینکا۔ زور کا چھنا کا ہوا اور میں چلا اُٹھا۔ وہ شخص اسٹاک بروکر مارک تو نہیں؟''

''نہیں راکی نہیں... وہ میرا بینک منیجر ہے... میں اُس کی صحبت میں خوش رہنے لگی ہوں... اُسے چاہنے بھی لگی ہوں۔''

''ڈائی وورس (DIVORCE) کب چاہیے؟''

''کبھی نہیں... تمھاری قدر اب بھی میرے دل میں باقی ہے اور محبت بھی۔''

کیتھی کا ہر انکشاف مجھے پریشان کر رہا تھا۔ جب اُس نے میرا سُرخ چہرہ اور غصے سے بھری آنکھیں دیکھیں تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُسے چوما، آنکھوں سے لگایا۔ پھر صدقِ دل سے گویا ہوئی:

''راکی تم نے زندگی میں میرا ہر فیصلہ مانا ہے.... میری ہر بات کا احترام بھی کیا ہے.... تمھاری نظر میں یہ ضرور گناہ ہے جو میں کر رہی ہوں، لیکن میرے نزدیک یہ گناہ نہیں ہے۔ میں نے سدا اپنے من کی خوشی چاہی ہے.... میں تم کو پوری اجازت دیتی ہوں تم جس عورت سے چاہو تعلق قائم کر سکتے ہو۔ مجھے ذرا بھی شکایت نہ ہوگی۔ بلکہ خوشی ہوگی۔''

راکی نے تمام انکشافات اپنے دوست کرشن گوپال گوسوامی سے دردناک انداز میں کیے تھے۔ اُس کی گردن زمین میں دھنس چکی تھی۔ میں نے بے ساختہ اُس سے جاننا چاہا:

''تو کیا کیتھرین اپنی میرج بچانے کی خاطر تم سے اوپن ریلیشن شپ (OPEN RELATIONSHIP) کا سلسلہ چاہتی ہے؟''

''ہاں....ورنہ ہمارے راستے الگ الگ ہوں گے۔''

''تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟''

جس قدر میری بے تابی بڑھ رہی تھی۔ اُسی قدر وہ خود میں ڈوبا جا رہا تھا۔ غمگین، اُداس، ٹوٹا پھوٹا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر تأسف کے ساتھ گویا ہوا:

''بھلا مَیں کیا سوچ سکتا ہوں ...اگر مَیں کیتھی کو چھوڑتا ہوں تو اُس کے بغیر جیتے جی مر جاؤں گا۔ دِن کاٹنا مشکل ہوگا...اور اگر اُس کی تجویز مان لیتا ہوں تو یہ احساس ہی مجھے کھا جائے گا کہ میری بیوی کا تعلق کسی غیر سے بھی ہے۔''

مَیں نے ہاتھ بڑھا کر اپنائیت سے اُس کے کندھے پر رکھ چھوڑا۔

''کیا کیتھرین کو یہ خیال نہیں کہ وہ تمھاری محبت کو ٹھکرا کر اپنا گھر برباد کر رہی ہے؟''

''نہیں بالکل نہیں...وہ سدا اپنے من کی غلام رہی ہے...البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ کسی گلٹ (guilt) یا جھوٹ کے سہارے زندہ رہنا پسند نہیں کرتی؟''

''اس وجہ سے وہ تم پر دباؤ ڈال رہی ہے کہ تم جس سے چاہو اپنا ناتہ جوڑ لو؟''

راکی کا سر جھک گیا تھا۔ اچانک مدت پہلے اپنا ہی کہا ہوا ایک کوندے کی طرح میری طرف لپکا:

''اگر اخلاقی اور جنسی آزادی اپنی حد سے بڑھ کر غیر فطری صورت اختیار کر بیٹھے تو وہ آدمی کی شخصیت میں دراڑیں ڈال کر اُس کی رہی سہی زندگی بھی غارت کر ڈالتی ہے۔''

اگر راکی نے تمدنوں کے بنیادی فرق کو سمجھ لیا ہوتا تو آج اُسے کورکھشیتر کے میدان سے نہ گزرنا پڑتا۔ جذباتی بحران کا شکار نہ ہونا پڑتا۔ وہ حد درجہ مجبور ہو کر بولا:

''اِن حالات میں تم ہی بتاؤ مَیں کیا کروں؟''

مَیں پلک جھپکنے سے پہلے ہی اُس سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ کیتھرین سے فوراً علیحدہ ہو جائے۔ مگر یہ سوچ کر رُک گیا کہ وہ اپنے ماضی کی تمام کشتیاں جلا چکا ہے۔ اُس کی ازدواجی زندگی کا قافلہ بھی

سرِ عام لُٹ چکا ہے۔ اپنے پریوار سے بھی وہ الگ ہو چکا ہے۔ کہیں میری بات کا ردِ عمل برعکس نہ ہو۔ مَیں نے محض اُس کا دل رکھنے کی خاطر کہا:

'' آؤ باہر چل کر تازہ ہوا میں کچھ سوچتے ہیں...کوئی راستہ نکل ہی آئے گا۔''

اور اب مَیں پب کے ایک تاریک گوشے میں تنہا بیٹھا خود کو کوس رہا ہوں کہ مَیں نے راکی کو روکا کیوں نہیں؟ اُسے جانے کیوں دیا؟ وہ اتنا پریشان تھا، اتنا ٹوٹ چکا تھا کہ اِن حالات میں وہ کوئی بھی اُلٹا سیدھا قدم اُٹھانے کی جرأت کر سکتا ہے؟ یہ خیال میرے ذہن میں آتے ہی میرے بدن میں زلزلہ آ گیا اور مجھے خود سے اتنی گھِن ہونے لگی کہ اگر اُس وقت میری جیب میں پستول موجود ہوتا تو مَیں چھ کی چھ گولیاں اپنے سینے میں اُتار کر خود کو ختم کر ڈالتا۔

مَیں نے بئیر سے بھرا گلاس وہیں چھوڑا۔ تیزی سے اُٹھا اور پب سے باہر نکل کر میرے پانو راکی کے گھر کی طرف اُٹھنے لگے۔

بند دروازے

وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔

مَیں جانتا تھا کہ افسرِ اعلیٰ کے ایک دستخط سے میرا تبادلہ ہو جائے گا اور مجھے یہ شہر چھوڑنا پڑے گا۔ جہاں میرے یار دوست تھے، واقف کار تھے اور بہت سے چاہنے والے بھی تھے۔ اِن دُنیاوی رشتوں کے علاوہ میری گرل فرینڈ بھی وہیں موجود تھی جس کی جدائی مجھے ذہنی امراض کے ہسپتال تک بہ آسانی پہنچا سکتی تھی کہ مَیں اُسے اپنی ذات سے زیادہ پیار کرتا تھا۔لیکن یہ سارے حقائق میرے انگریز افسر کے آگے غیر اہم، غیر ضروری اور غیر منطقی تھے۔ وہ اکثر دبے دبے لفظوں میں مجھے نصیحتیں کرتا رہتا تھا۔اس بار بھی اُس نے دانشورانہ انداز میں پائپ کا دھواں فضا میں چھوڑ کر کہا تھا:

''سماجی زینہ طے کرتے وقت مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا کرتے۔ ورنہ یہ رشتے ناتے زنجیریں بن جاتے ہیں اور آدمی خود کو چوراہے پر کھڑا پاتا ہے۔ اِس کا احساس تم کو تب ہوگا جب تم میری پوزیشن کو پہنچو گے۔''

لہٰذا ایک فرماں بردار بالک کی طرح، جسے دور سے ایک خوبصورت کھلونا دِکھلا کر لبھا لیا جاتا ہے، مَیں نے بھی اپنے افسر کے تجربات کے آگے سر جھکا دیا۔ استعفیٰ دینے کا مجھ میں حوصلہ تھا اور نہ ہی ہمت۔ پردیس میں پردیسیوں کو تب ہی ملازمت نصیب ہوتی ہے جب اُس مخصوص کام کے لیے مقامی لوگ دستیاب نہ ہوں۔ جب کہ صورتِ حال یہ تھی کہ دیش بھر میں لاکھوں آدمی بے کار گھوم رہے تھے۔ وہ تو یہاں تک کہا کرتے تھے کہ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو واپس بھیج دو، بے روزگاری کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ لیکن مَیں خوش قسمت تھا کہ برسرِ روزگار تھا، عہدہ بھی بُرا نہیں تھا اور نسلی امتیاز کی خطرناک وبا سے بھی کچھ کچھ بچا ہوا تھا۔

باتھ (BATH) چھوٹا سا تاریخی شہر ہے۔ خوبصورت، پُرامن اور رومن تہذیب کے نشانات سے مالا مال۔ وہ شہر میرے اندر اس حد تک بس چکا تھا کہ اُس پر آخری نظر ڈالتے وقت یہ محسوس ہوا کہ مَیں خود سے الگ ہوا جا رہا ہوں۔ دل تھا کہ وہیں رہنے کا خواہش مند تھا۔ لیکن پیٹ، جس نے دُنیا کے بانوے فی صد عوام کو اپنا غلام بنا رکھا ہے، مجھے بھی اپنے شکنجے میں جکڑے ایک نئی منزل کی طرف لیے جا رہا تھا۔ یوں تو لندن شہر میرے واسطے نیا نہیں تھا۔ مَیں کئی مرتبہ کمپنی کے کام سے وہاں جا چکا تھا۔ لیکن ہر مرتبہ یہی گمان گزرتا تھا کہ مَیں چلتے پھرتے بُتوں کے شہر میں چلا آیا ہوں۔ ہر بُت خاموش، ذاتی پریشانیوں میں گھرا ہوا، منہ لٹکائے خود میں کھویا ہوا۔ گفتگو کے دوران وہ ایک ہی تأثر دیا کرتا کہ جو اُس کے دل میں ہے وہ اُس کی زبان پر نہیں ہے اور جو اُس کی زبان پر ہے، وہ بناوٹ، جھوٹ اور سچ کا مرکب ہے۔ اُسے کھنگالنے پر اُس کی شخصیت کے چند پہلو ضرور نمایاں ہوتے۔ لیکن اُس کی اصل ذات پھر بھی کہیں چھپی رہتی۔ لگتا کہ وہ کوئی گہرا دریا ہے جس کی تہہ کو چھونا اتنا آسان نہیں۔

کافی دوڑ دھوپ کے بعد جہاں مَیں نے اپنی رہائش کا بندوبست کیا تھا، وہ مسز جیکسن کا ٹیوڈر ہاؤس تھا۔ وہ مکان بظاہر دیکھنے میں عام سا تھا۔ اینٹوں کا رنگ پھیکا پڑ چکا تھا، دروازے اور کھڑکیوں سے رنگ و روغن بھی غائب تھا۔ لیکن جب مَیں مسز جیکسن کے ساتھ لینڈنگ سے ہو کر کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا تو مکان کی اندرونی آرائش اور نفاست دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

دیواروں پر جاذب نظر وال پیپر۔ چھوٹی چھوٹی سنہری فریم کردہ تصویریں، قد آدم آئینہ اور سفید سیڑھیوں پر سُرخ غالیچہ۔ یہی حال کمرے کا بھی تھا۔ بے داغ فرنیچر سے آراستہ ہر کونہ اپنی اہمیت جتا رہا تھا۔ کمرے کا جائزہ لے کر میں مطمئن ہو چکا تھا۔ مسز جیکسن پُر وقار عورت تھی۔ صاف ستھری، لمبی اونچی، بھرا بھرا بدن اور چہرے پر اتنی چابکدستی سے میک اَپ کیا گیا تھا کہ اُس کی صحیح عمر کا جاننا مشکل تھا۔ لیکن اُس کے ہاتھوں کی جھریوں سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ستاون اٹھاون برس سے کم نہیں ہے۔ اُس نے ایک ہفتے کا کرایہ پیشگی لے کر مکان اور کمرے کی چابیاں میری طرف بڑھا دیں۔ پھر قدرے سخت لہجے میں گوش گزار ہوئی:

''مجھے صفائی سے گہری محبت ہے۔''

مَیں نے اثبات میں گردن ہلا کر اُسے باور کرانا چاہا کہ اس معاملے میں اُسے مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو گی۔

''کچھ باتیں اور.... رات دیر سے آنے پر کوئی کرفیو نہیں ہے مگر اتنا یاد رکھنا، کسی کی نیند خراب نہ ہو۔ اِس گھر میں کچھ اور لوگ بھی رہتے ہیں.... کرایہ ہر ہفتہ اتوار کی صبح دینا ہوگا۔''

یہ کہہ کر اُس کی بلوری آنکھوں میں چمک اُبھر آئی تھی اور چمک بھی کچھ ایسی کہ وہ مدت سے مجھے قریب سے جانتی ہو۔

''چوں کہ تم جوان ہو اور خوش شکل بھی، اگر مَیں نے کسی لڑکی کو تمھارے ساتھ اس مکان میں دیکھ لیا تو اگلے روز یہ کمرہ خالی کرنا ہوگا۔''

شرط کڑی تھی۔ مَیں بروقت اُسے بتا دینا چاہتا تھا کہ میری گرل فرینڈ، جس سے مَیں جلد ہی شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ وہ جب کبھی لندن آئے گی تو عین ممکن ہے یہاں بھی آئے۔ لیکن مسز جیکسن کی شخصیت کا رعب، قدرے سخت لہجہ اور عائد کردہ پابندی نے مجھے اتنا سحر زدہ کر دیا تھا کہ مجھ میں لب کشائی کی ہمت ہی نہ ہوئی۔

مسز جیکسن نے اپنا مکان دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ مکمل گراؤنڈ فلور اُس نے اپنی رہائش کی خاطر مختص کر رکھا تھا۔ کسی لاجر کو وہاں جانے کی ضرورت نہ پڑتی تھی اور نہ ہی کوئی اُس کی

نجی زندگی میں دخل دیا کرتا تھا۔ اوپر کی منزل پر تین کمرے تھے۔ سب سے بڑا کمرہ میرے پاس تھا جس کی کھڑکی سڑک اور باغیچے کی طرف کھلا کرتی تھی۔ برآمدے کے آخر میں ایک طرف باتھ روم رٹائلیٹ تھا تو دوسری طرف کچن۔ میرے ساتھ والے کمرے میں جو طالب علم رہتا تھا اُس کا نام کلدیپ شیر گل تھا۔ وہ یہیں پیدا ہوا تھا۔ یہیں پڑھ لکھ کر اُس نے دو اے لیول (A-LEVAL) حاصل کیے تھے اور اب اونچی تعلیم کی خاطر کسی یونیورسٹی میں داخلہ لینے میں کوشاں تھا۔ اُس کے ماں باپ اسی شہر میں مقیم تھے، جو تیس برس پہلے پنجاب کے کسی گانو سے یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ کلدیپ اُن سے گاہے گاہے ملتا رہتا تھا۔ لیکن دونوں نسلوں کے درمیان تہذیبی اور ذہنی فاصلے اتنے زیادہ تھے کہ اُسے اپنے والدین کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے گھٹن کا احساس شدت سے ہوا کرتا۔ وہ چہرے مہرے سے ہندوستانی ضرور لگتا تھا مگر اُس کے خول میں مغربی تہذیب کا منجھا ہوا شخص سانس بھر رہا تھا، جس پر اُسے ناز بھی تھا۔ کچن کے ساتھ باکس روم کا لاجر راجا نندن تھا۔ گہرا کالا رنگ، عمر اکیس بائیس برس۔ وہ سری لنکا کے علاقے جافنا (JAFNA) کا رہنے والا تھا، جہاں گذشتہ دو دہائیوں سے زوروں کا رن پڑ رہا تھا۔ پورا صوبہ رن بھومی بنا ہوا تھا۔ وہاں صدیوں سے آباد تامل ہندو اُس علاقے کو سری لنکا سے کاٹ کر آزاد دیش بنانے کی فکر میں تھے۔ راجا نندن اپنے گھر والوں کے متعلق ہر دم فکر مند رہا کرتا تھا۔ ہر پل خاموش اور سنجیدہ۔ میں نے اُسے مسکراتے ہوئے شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔ مگر ایک صبح اُسے چینائی سے فون پر اطلاع ملی کہ اُس کے خاندان کے سبھی افراد خیریت سے وہاں پہنچ گئے ہیں۔ اُس روز پہلی بار میں نے اُسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ کمپیوٹر سائنس کی ایڈوانس اسٹڈی کر رہا تھا۔ شام کے وقت وہ کسی تھیٹر میں گیٹ کیپر کا کام بھی کرتا تھا۔ اُس کی دلی خواہش تھی کہ ڈگری ملنے پر وہ امریکا یا کینڈا میں منتقل ہو جائے۔ پھر رفتہ رفتہ پریوار کے ہر فرد کو بلائے۔

ایک انگلش لینڈ لیڈی کے مکان میں تمام ایشیائی لاجروں کو دیکھ کر میں نہ صرف حیرت زدہ تھا بلکہ دماغ کی کھڑکیاں بھی اس وجہ سے کھل گئی تھیں کہ مسز جیکسن نے تمام رنگ دار لاجروں کو اپنے ہاں کیوں رکھا ہوا ہے؟ بہت کم انگریز عورتیں ایسی تھیں جو ایشیائی لوگوں کو لاجر رکھا کرتی

تھیں۔ مجھے اس سلسلے میں گونا گوں تجربات ہو چکے تھے۔ کچھ تو لندن میں لیکن زیادہ تر بولٹن، مانچسٹر، ازرباتھ میں۔ جب کبھی مَیں نے کسی انگریز عورت کے دستک دی تھی تو میری صورت دیکھ کر اُس کا رنگ بدل جایا کرتا، جیسے میں کم تر درجے کا کوئی شخص اُس کے در پر چلا آیا ہوں۔ پھر وہ اپنے حواس درست کر کے ملائمت سے کہا کرتی: "SORRY THE ROOM HAS GONE"۔ کئی مرتبہ یوں بھی ہوا کہ مَیں نے دستک دی، کسی کھڑکی سے پردہ سرکا، چور آنکھ نے مجھے دیکھا اور پھر دروازہ نہیں کھلا۔ ٹیلی فون پر تو چھوتے ہی اُنھیں میرے لب و لہجے، جملوں کی ساخت اور الفاظ کی بندش سے احساس ہو جایا کرتا کہ مَیں کوئی ایشیائی ہوں۔ پھر وہ اتنی صفائی سے مجھے ٹال دیتے کہ مجھے بُرا بھی نہ لگے اور نہ ہی میرے جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ لیکن جہاں مسز جیکسن کا سوال تھا تو وہ سب سے الگ تھلگ ثابت ہوئی تھی۔ نہ تو فون پر اُس نے انکار کیا تھا اور نہ ہی اُس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ بلکہ وہ نہایت اخلاق اور مہذب طریقے سے پیش آئی تھی۔ یہ تمام حقائق گنجل کی صورت اختیار کیے میرے اندر اُتر گئے تھے۔

اور ایک سرد شام مَیں اور کلدیپ کچن میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ وہ میرے اصرار پر ہی وہاں رُک گیا تھا۔ ورنہ اُس کا معمول تھا کہ چائے بنائی، مگ اُٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ پھر گھنٹوں باہر نہیں نکلا کرتا تھا۔

وہ میرے سامنے خاموش بیٹھا کھڑکی سے باہر اُترتے ہوئے اندھیرے کو دیکھ رہا تھا، جو درجہ بدرجہ گہرا ہوا جا رہا تھا۔ مَیں بے ساختہ اُس سے پوچھ بیٹھا:

''کلدیپ، تم کو یہاں رہتے ہوئے چار پانچ ماہ بیت چکے ہیں۔ یہ بتاؤ میرے آنے تک میرے کمرے کون رہا کرتا تھا؟''

''کوئی بھی نہیں، تمھارے آنے تک وہ کمرہ بند تھا۔''

''اچھا....؟''

''ہاں، کیوں؟.... کیا بات ہے؟''

''بات تو کچھ بھی نہیں۔''

چائے کا گھونٹ بھر کر میں نے دوسرا پہلو دریافت کرنا چاہا:
''تم کو کبھی یہ خیال تو ضرور آیا ہوگا کہ مسز جیکسن نے اپنے ہاں سبھی رنگ دار لاجر کیوں رکھے ہوئے ہیں اور وہ بھی سب کے سب ایشیائی؟''
''میں نے اس طرف کبھی دھیان نہیں دیا۔''
اُس نے معصومیت سے جواب دیا۔ پھر فوراً ہی لہجہ بدل لیا:
''اگر ایسا ہے بھی تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟''
''حرج تو کچھ بھی نہیں ...لیکن ایک سفید عورت کے ہاں سبھی رنگ دار لاجرز کو دیکھ کر عجب سا نہیں لگتا؟''
''لگنا تو نہیں چاہیے.... یہاں کے لوگ اب ہر کسی کو قبول کرنے لگے ہیں۔''
''کس سطح پر؟''
''میں سمجھتا ہوں ہر سطح پر..... نسلی بھید بھاؤ بھی آہستہ آہستہ کم ہو رہا ہے.....سوسائٹی کے ہر شعبے میں ہر رنگ کے لوگ کام کر رہے ہیں اور وہ تیزی سے اپنا مقام بھی بنا رہے ہیں.''
جس اعتماد کے ساتھ وہ اپنا ذہن اُگل رہا تھا، اس سے واضح تھا کہ مقامی لوگ تارکینِ وطن کو ہر سطح پر قبول کیے جا رہے ہیں۔ اونچ نیچ اور نسلی بھید کی دیواریں بھی گرتی جا رہی ہیں لیکن میرے نزدیک حقیقت برعکس تھی۔ سلطنتِ برطانیہ کا عروج، اس کا غرور، نسلی برتری اور رنگوں کا امتیاز اپنی جگہ قائم تھا۔ وہ فخر سے بول اُٹھا:
''میری طرف دیکھو۔۔۔ میری نسل تو کب کی یہاں کا حصہ بن چکی ہے۔ میں خود کو مقامی لوگوں سے الگ نہیں سمجھتا۔ میرے حقوق بھی وہی ہیں، جو ایک انگلش آدمی کے ہیں۔''
ایسا لگا کہ میرے سامنے بیٹھا ہوا شخص انڈین نہیں، برٹش ہے۔ اس کا خمیر بھی انگریزوں کی دھرتی سے اٹھا ہے اور وہ آنکھ بھی مغربی رکھتا ہے۔ جبکہ میری آنکھ مشرقی تھی۔ کہاں مغربی تہذیب اور کہاں گنگا جمنی تہذیب؟ دونوں کی اقدار، ثقافت اور وِرثہ میں فرق ٹھہرا۔

انگریز آدمی کا مکان اس کے نزدیک ایک قلعے کی حیثیت رکھتا ہے، جس میں داخل ہونے کے واسطے کسی اجنبی کو سو سو جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مسز جیکسن کا مکان بھی قلعے سے کم نہ تھا۔ مکان کا وہ حصہ جو اس نے ذاتی استعمال کے لیے مخصوص کر رکھا تھا، اس کے دروازے ہر دم بند رہا کرتے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان دیواروں کے پیچھے کیا ہے؟ دن بھر اکیلے میں مسز جیکسن کی سرگرمیاں کیا رہتی ہیں؟ کبھی کبھار وہ اپنے کچن میں کھانا بناتے ہوئے ضرور دکھ جاتی۔ مگر کسی لاجر کی آہٹ پا کر یا اسے دیکھ کر کھڑکی پر پردہ فوراً کھینچ دیتی۔ دو تین مرتبہ میں نے باغیچے کا گیٹ کھولتے وقت اسے دیکھا تھا کہ وہ لاؤنج میں بیٹھی کتاب پڑھنے میں منہمک ہے۔ یقیناً کتابوں سے اس کی دوستی بڑی گہری تھی۔ البتہ شام میں اس کے چند گنے چنے ہم عمر دوست اُس سے ملنے کو چلے آتے۔ لیکن ویک اینڈ پر صرف مسٹر اسمتھ ہی اس کے ہاں دکھائی دیتا۔ وہ ساٹھ باسٹھ برس سے کم نہ تھا۔ ممکن ہے کچھ زیادہ بھی ہو، اچھی خوراک عمر اور چہرے پر کئی پردے ڈال دیتی ہے۔ یوں تو وہ معمولی شکل و صورت رکھتا تھا۔ مگر کپڑے اتنے غضب کے پہنا کرتا تھا کہ بار بار اسے دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ اس کی آمد پر مسز جیکسن کی شخصیت ہی بدل جایا کرتی تھی۔ وہ بن سنور کر ہوا میں اڑتی ہوئی، اس کا بازو تھامے کسی پب (PUB) کی رونق میں اضافہ کرنے کو چل دیتی۔ رات دیر میں واپسی پر دونوں جھومتے جھامتے ایک دوسرے کو سنبھالتے گھر میں داخل ہوتے، وہیں شب باشی کرتے اور پھر اگلے روز بھی وہ وہیں رکتا۔ میں یہ تمام نظارے اپنی کھڑکی سے چوری چھپے دیکھا کرتا تھا۔ حالانکہ بارہا دل نے لعنت ملامت بھی کی تھی کہ کسی کی نجی زندگی میں تاک جھانک کرنا غیر اخلاقی عمل ہے، لیکن میں تو الجھے ہوئے گنجل کو کھولنا چاہتا تھا۔ قلعے کی کوئی کمزور دیوار توڑنے پر کمربستہ تھا۔ اڑوس پڑوس کے لوگوں سے میں یہ بھی جان چکا تھا کہ مسز جیکسن طلاق شدہ ہے۔ اُس کا جوان بیٹا اسکاٹ لینڈ میں کہیں مقیم ہے۔ کرسمس کے دنوں میں وہ اپنی ماں سے ملنے ضرور آتا ہے۔

کلدیپ شیر گل کو یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا اور اسٹوڈنٹ گرانٹ بھی۔ اُس کا کمرہ

خالی ہوتے ہی ایک ایسی تجویز میرے ذہن میں ابھری کہ میں قلعے کی کمزور دیوار تو کیا، مضبوط دیوار بھی چٹکیوں میں توڑ سکتا تھا۔ لہذا میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار کیا۔ حیلے حوالے ازبر کیے اور جس روز مسز جیکسن کا دروازہ کھٹکھٹایا، وہ مجھ کو اپنی دہلیز پر کھڑا پا کر اتنی حیران ہوئی کہ اس کی آنکھیں پھیل کر دوگنی ہو گئیں۔

''ایک ضروری کام تھا، اس لیے آیا ہوں۔''

وہ ایک چوتھائی دروازہ کھول کر جوں کی توں کھڑی رہی۔ انگریز عورت پورا دروازہ تب ہی وا کیا کرتی ہے، جب وہ سامنے کھڑے شخص کو اندر باہر سے جانتی ہو۔ میری حیثیت تو محض ایک لاجر کی تھی۔ لیکن میرا اصرار اپنی جگہ قائم تھا۔

صاف ستھرے لاؤنج کی آرائش معیاری تھی۔ فرنیچر کا ہر ٹکڑا کہہ رہا تھا کہ مجھے سوچ سمجھ کر ہاتھ لگانا، ورنہ تمہارا ہاتھ جھٹک ڈالوں گا۔ محتاط ہو کر میں آرام دہ صوفے پر پھیل گیا۔

''میرا ایک قریبی دوست ہے۔ وہ ان دنوں بیڈ اینڈ بریک فاسٹ میں رہ رہا ہے۔ اسے کمرے کی سخت ضرورت ہے۔ اسی لیے حاضر ہوا ہوں۔''

ردِعمل گہرا ہوا تھا۔ گول چہرہ خوشگوار مسکراہٹ سے بھر گیا۔

''ظاہر ہے تمہارا دوست تمہارے ہی ملک سے ہوگا؟''

''نہیں میڈم۔۔۔ وہ اِسی ملک کا شہری ہے۔''

''تو پھر اُس کی پیدائش یہاں کی ہوگی؟''

''پیدائش تو اُس کی یہاں کی ضرور ہے۔۔۔ مگر شائد آپ اِس خیال میں ہیں کہ وہ ایشین ہے۔۔۔ مگر ایسا نہیں ہے۔۔۔ وہ انگلش ہے۔''

ردِعمل اس مرتبہ برعکس ہوا تھا۔ گہری سوچ نے اسے گھیر لیا تھا۔ لیکن میں خوش تھا کہ میں نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی دھر دی ہے۔ میں نے ہنس کر کہا: ''کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کسی غیر ایشیائی کو کمرہ دینا پسند نہیں کرتیں؟''

چونکتے ہی اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا، گویا میں نے اسے کے سینے میں گھس کر اس کا اہم راز جان لیا

ہو۔لیکن مجھے ہنستا ہوا پاکر وہ بھی زبردستی ہنسنے لگی تھی۔اس نے میری ہنسی کا فائدہ اتنی چابکدستی سے اٹھایا کہ وہ میرے وار سے صاف صاف بچ نکلی تھی۔بولی:

''تم آدمی دلچسپ لگتے ہو۔'' پھر نظریں چرا کر اس نے دیوار پر لٹکتی مونالزا کی تصویر کو دیکھا اور کہا: ''میرے ہاں ہر شہریت کے لوگ رہتے رہے ہیں۔انگلش،آئرش،ویسٹ انڈین،چائنیز۔۔۔۔ زیادہ تر انگلش ہی ہوا کرتے تھے۔بُرے بھلے ہر قسم کے لوگ تھے وہ۔۔۔لیکن یہ کہنا اب ضروری ہے کہ تم ایشین کو میں نے زیادہ امن پسند،قابلِ اعتبار اور نیک دل پایا ہے۔''

''شاید اسی لیے آپ صرف ایشینز (ASIANS) کو اپنے ہاں لاجر رکھنا پسند کرتی ہیں؟''

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ میری نظر میں سب برابر ہیں۔گورے، کالے، رنگدار۔۔۔پھر تم لوگ ہمارے لیے اب غیر تو نہیں رہے۔یہاں کا حصہ بن چکے ہو۔۔۔یہ ملک اب صرف ہمارا نہیں،تمہارا بھی ہے۔ہم سب کا ہے۔''

وہ مجھے وسیع النظری کے ساتھ انسانی سطح پر سانس لیتی ہوئی محسوس ہوئی۔اُس پل کلدیپ شیر گل کہیں سے اُبھر کر میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔اس کے بول میرے کانوں سے ٹکرا رہے تھے۔

''مقامی لوگ اب ہمیں ہر سطح پر قبول کرنے لگے ہیں۔ہم اس سوسائٹی کا حصہ بن چکے ہیں۔میں خود کو ان سے الگ نہیں سمجھتا۔''

''پھر تو آپ کو ہم سے اتنی ہی ہمدردی ہوگی،جتنی اپنے لوگوں سے ہے؟''

اُس نے نظریں چرا کر پھر مونالزا کی تصویر کو دیکھا اور بولی:''جھوٹ نہیں بولوں گی۔اپنے لوگوں سے مجھ کو ہمدردی زیادہ ہے۔ہونی بھی چاہیے کہ میں بھی انگلش ہوں۔لیکن مجھے لڑائی جھگڑے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔۔۔رات رات بھر پارٹیاں،میوزک،شور شرابا اور ناچ گانا اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا؟''

''لیکن میڈم۔۔۔پارٹیوں میں پینا پلانا،ناچ گانا،شور شرابا تو ہوتا ہی ہے؟''

''میں جانتی ہوں۔ہم انگلش اور ویسٹ انڈینز اس کے بنا نہیں رہ سکتے۔یہ ہمارا کلچر ہے۔لیکن بوڑھی عمر میں یہ چیزیں اپنی کشش کھو بیٹھتی ہیں۔''

''مگر آپ تو ابھی جوان ہیں''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی: ''تم واقعی آدمی دلچسپ ہو۔ شاید تم نہیں جانتے، تم سے بڑی عمر کا تو میرا بیٹا ہے۔''

''اچھا۔'' میں صریحاً انجان بن گیا: ''اسے کبھی دیکھا نہیں؟''

''وہ گلاسگو، اسکاٹ لینڈ میں رہتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کہیں دور نکل گئی تھی۔ آنکھیں روشن ہوتے ہی سوئی ہوئی ممتا بھی جاگ اُٹھی تھی، لیکن روشن آنکھوں میں اُداسی کی جھلک بھی تھی اور لہجے میں کرب بھی۔ اِس بار مَیں نے منہ پھیر کر مونا لزا کی تصویر کو دیکھا، جس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ سے یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ ذاتی طور رخوش ہے یا اُسے کسی بات کا دُکھ ہے، افسوس ہے؟ یہی حال مسز جیکسن کا بھی تھا۔ وہ ماضی میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔ خاموشی نے جڑ پکڑی تو مَیں مسز جیکسن کی باتوں میں اُترتا چلا گیا کہ اُن میں کہاں تک سچ تھا، جھوٹ تھا، آمیزش تھی۔ لیکن ہر پل یقین دلا کر گزر رہا تھا کہ سچ جھوٹ پر حاوی تھا۔ آمیزش کا شائبہ تک نہ تھا۔ اِس لیے کہ سچ کے پیچھے اُس کے ذاتی تجربات تھے۔ ڈھلتی عمر کے خوف تھے اور پُر امن زندگی گزارنے کی تڑپ تھی۔ اچانک وہ بول اُٹھی:

''مسٹر خان، تمھارا دوست کرتا کیا ہے؟''

مَیں اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے والا تھا۔ لیکن مَیں تو ہر مشکل کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔ چھوٹتے ہی بولا:

''ہم ایک ہی کمپنی کے ملازم ہیں.....وہ حال ہی ڈربی سے ٹرانسفر ہو کر آیا ہے.....بہت اچھا آدمی ہے۔ میری ہی طرح اکیلا ہے اور.....''

''مَیں سمجھ گئی۔ لیکن میرا اصول ہے کہ جب تک آدمی کو دیکھ نہ لوں کوئی فیصلہ نہیں کرتی۔''

''کہو تو آج ہی اُسے بلا لوں؟''

وہ میرے بے ساختہ پن سے جھنجھلا اُٹھی:

''نہیں نہیں اتنی جلدی بھی کیا ہے.....کمرہ تو خالی ہے ہی۔ کچھ دن رُک جاؤ پھر بلا لینا.....بعد میں

دیکھیں گے کیا کرنا ہے۔"
اُس کے گول مول جواب نے میرا ذہنی گنجل کھول ڈالا تھا۔ دھند کے چھٹتے ہی ہر شے صاف ہوگئی تھی۔ مَیں جان چکا تھا کہ آئندہ وہ اس سلسلے میں کبھی مجھ سے بات نہیں کرے گی اور نہ میں اُس سے پوچھ گچھ کروں گا۔

راجا نندن کی دن رات کی کمپیوٹر محنت رنگ لائی تھی۔ اُس نے "بی ایس سی ایڈوانس ڈگری" امتیازی حیثیت سے پائی تھی۔ جسے اُس نے فریم کروا کر اپنے چھوٹے سے کمرے کی دیوار پر لٹکا دیا تھا۔ اب وہ ہر دم مسکراتا رہتا تھا۔ کسی کا نصیب جاگنے میں کیا دیر لگا کرتی ہے؟ راجا نندن کو امریکا کی امیگریشن بھی جلد مل گئی تھی۔ لیکن امریکا جانے سے پہلے وہ دوستوں کو الوداعی پارٹی دینا چاہتا تھا۔ اپنا کمرہ چھوٹا ہونے کے کارن پارٹی کے واسطے وہ میرا کمرہ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ مَیں نے خوشی خوشی اُسے اجازت دے دی تھی کہ دوسروں کی خوشی میں رُکاوٹ بننا میرے کردار کے خلاف تھا۔ یوں بھی مَیں راجا نندن کو بہت پسند کرتا تھا۔ مَیں اور وہ جب مسز جیکسن کو پارٹی میں شرکت کرنے کی دعوت دینے گئے تو اُس نے یہ کہہ کر ہمیں ٹالنا چاہا کہ اُس کی ہر سنیچر کی شام جارج اسمتھ کے لیے مخصوص ہوا کرتی ہے۔ وہ شام اُسی کے ساتھ بتایا کرتی ہے لہٰذا اُس کا پارٹی میں شریک ہونا ممکن نہ ہوگا۔ لیکن جب ہم، خاص طور پر مَیں اِس بات پر اڑ بیٹھا کہ وہ کچھ دیر کے لیے آ کر ٹوسٹ پروپوز (TOAST PROPOSE) کرے۔ جارج کو بھی ساتھ لے کر آئے۔ ہم اُس سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ پھر آپ دونوں ایک چھوٹی سی ڈرنک پی کر چلے جائیں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ تب کہیں مسز جیکسن کچھ سوچ کر راضی ہوئی تھی۔

سنیچر کی شام تھی۔ راجا نندن کے یار دوست ایک ایک کر کے میرے کمرے میں جمع ہو چکے تھے۔ وہ اُن میں گھرا ہوا چہک رہا تھا۔ ہر کوئی اُس کی کامیابی پر خوش تھا۔ رنگ دار چہروں میں ایک سفید فام چہرہ بھی موجود تھا، جس کی دیکھ بھال سبھی کر رہے تھے اور وہ بھی ہر کسی سے جلد

گھل مل گیا تھا۔ خورد و نوش اور پینے پلانے کا سامان اتنی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا کہ بھوک چمک اُٹھی تھی۔ ہر شے تیار تھی۔ صرف مسز جیکسن کی آمد کا انتظار تھا کہ وہ آئے اور راجا نندن کا جامِ صحت نوش فرمائے اور پارٹی کا آغاز ہو۔ لیکن سیڑھیاں خاموش تھیں۔ کوئی آہٹ کوئی چاپ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وقت کچھ اور آگے سرکا تو راجا نندن اور اُس کے دوستوں کے اصرار پر میں مسز جیکسن کو بلانے چل دیا۔ سیڑھیاں اُتر کر ہال وے سے ہوتا ہوا اُس کے در پر پہنچ گیا۔ دستک دینے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اندر سے مسز جیکسن کی دبی دبی آواز سنائی دی:

"جارج...وہ لوگ انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہمیں اب پارٹی میں چلنا چاہیے۔"

"تمھارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟"

"تم پارٹی میں ساتھ رہو گے تو اچھا لگے گا...دس منٹ کی تو بات ہے۔ چھوٹی سی ڈرنک پی کر لوٹ آئیں گے...وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

تمھارا دماغ واقعی خراب ہو گیا ہے...تم مجھے اُن لوگوں میں لے جانا چاہتی ہو جن کو میں دور سے بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ مگر ایک تم ہو کہ سارا گھر BLOODY WOGS [1] سے بھر رکھا ہے۔"

"کیا کروں جارج...میری مجبوری بھی تو سمجھو...کیا تم سوچتے ہو کہ میں اِن لوگوں کو پسند کرتی ہوں؟"

ایک لمحے کو آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ میں نے کان دروازے کے ساتھ ہی لگا دیے۔ پھر ایکا ایکی آواز اُبھری:

"مجھے بھی اِن کا رنگ اچھا نہیں لگتا...لیکن کیا کروں۔ مجھے گھر بھی تو چلانا ہے۔ بزنس بھی تو کرنا ہے۔"

"تم سفید لاجر رکھ کر بھی تو بزنس کر سکتی ہو؟"

"تمھارا کہنا صحیح ہے۔ لیکن یہ ایشیائی لوگ پیسے دینے کے معاملے میں زیادہ کھرے ہیں، زیادہ ایمان دار ہیں۔ پھر یہ لڑائی جھگڑے سے بھی دور رہتے ہیں۔ شور شرابا بھی نہیں کرتے...یہ سب میرے واسطے بہت اچھا ہے۔"

ہونہ ہو کسی نے میرے کانوں میں سیسہ انڈیل دیا تھا۔ اردگرد کی ہر شے مجھ سے زیادہ پتھرا چکی

---

[1] (انگلش slang میں نہایت گری ہوئی گالی۔)

تھی۔ اتنے میں دروازہ کھلا تو مسز جیکسن مسکراتی ہوئی میرے سامنے کھڑی تھی۔ نظریں ٹکرائیں تو اُس نے مجھے پتھرایا ہوا دیکھ کر خود بھی پتھر بننا شروع کر دیا۔ ہم گز بھر کی دوری پر کھڑے تھے لیکن صدیوں پُرانے تاریخی، تہذیبی، نسلی فاصلے اور رنگوں کی تفریق جوں کی توں قائم تھی۔ منظر فریز (FREEZE) ہو گیا تھا۔ مزید وہاں رُکنا مناسب نہیں تھا۔ ہم اُلٹے پانو پھر کر اپنی اپنی سمت کو چل دیے۔
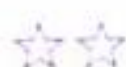
دھماکا

پارک رائل ہسپتال کا برآمدہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا۔ میرے دماغ کے ساتھ میری آنکھیں بھی برابر ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ باہر جانے کا راستہ بھی دِکھنے میں نہیں آرہا تھا۔ کچھ دیر پہلے مَیں سرجن کے کمرے میں تھا۔ اُس نے ایک فارم میری طرف بڑھایا تو اُس پر میری بیوی کے دستخط بھی موجود تھے۔ مَیں نے بھی اُس فارم پر دستخط کر کے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ سرجن نے مجھے یقین دلایا کہ آپریشن معمولی سا ہے، فکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایک دو روز میں تمھاری بیوی گھر بھی جانے کے قابل ہو جائے گی۔ مگر سرجن کا دلایا ہوا یقین اور اُس کے تسلی بخش جملے میری پریشانی کو دور نہ کر پائے بلکہ احساسِ گناہ میرے یہاں جڑ پکڑ بیٹھا اور مَیں اپنی ہی نظر میں گناہ گار بننے لگا۔

گھر پہنچ کر مَیں نے بوتل نکال کر ایک جام بنایا اور خود کو صوفے پر ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح پھیلا دیا جس نے اپنا کل اثاثہ داؤ پر لگا کر اُسے ہار دیا ہو۔ خود بخود میری نظریں

ڈرائینگ روم کے در و دیوار پر پھیل گئیں۔ ہر گوشہ خاموش تھا۔ اُس پر ویرانی یوں چھائی ہوئی تھی جیسے اُس کے ساتھ میرا تعلق ہی ختم ہو چکا ہو۔ کوئی وقت تھا کہ ان گوشوں کو آباد کرنے کے لیے مَیں نے کتنی محنت، کتنی عرق ریزی کی تھی۔ ہر ہفتے فیکٹری میں پچپن ساٹھ گھنٹے جان توڑ کر کام کیا تھا، تب کہیں میرا خواب پروان کی چند سیڑھیاں طے کر پایا تھا۔ میرے ہاں جب یار دوست یا مہمان آیا کرتے تو گھر کی آرائش، نفاست، قیمتی سامان اور نایاب اشیا کو دیکھ کر کہا کرتے کہ یہ ایک فیکٹری ورکر کا نہیں، ایک افسر کی رہائش گاہ ہے۔ اُس پل میرا سینہ گز بھر کا ہو جاتا اور جی چاہتا کہ وملا کو سب کی موجودگی میں اُٹھا کر چوم لوں۔ درحقیقت اس گھر کو بنانے اور سنوارنے میں میرا کم، وملا کا ہاتھ زیادہ رہا ہے۔ اُس کی پسند اور انتخاب اس قدر لاجواب ہے کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر انوکھی چیزوں کو جمع کرنے کا جنون اُس پر سوار رہتا ہے اور وہ اکثر دوڑ دھوپ کے بعد کوئی انمول شے حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔

پانچ برس پہلے جب مَیں اپنی ماں کے اصرار پر انڈیا گیا تھا تو اپنی مرضی کے مطابق اپنے جیون ساتھی کا انتخاب کرنا چاہا تھا۔ وملا سے کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ مجھے رتی بھر بھی احساس نہ ہوا تھا کہ وہ بلند ذوق رکھتی ہے۔ سُندرتا کی پُجارن ہے اور نایاب چیزیں جمع کرنا اُس کی کمزوری رہی ہے۔ وہ میری ہر بات کا جواب مختصر الفاظ میں ادا کر دیتی یا چھوئی موئی کی طرح سمٹ کر اپنے لمبے بالوں کے سروں کو اپنی اُنگلیوں پر لپیٹنے لگتی۔ اُس کی معصومیت، شرمیلا پن اور دلکش اداؤں سے صدیوں پرانی تہذیب نمایاں تھی، جسے دیکھنے کو میری روح لندن جیسے شہر میں ترسا کرتی تھی۔ مَیں نے اپنے متعلق اُسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہاں کی ایک فیکٹری میں ملازم ہوں اور کرائے دار کی حیثیت سے ایک کمرے میں مقیم ہوں۔ لیکن اگر وہ ساتھ دے گی تو جلد ہی اپنا مکان خرید لوں گا۔ یوں تو مَیں بھی ہر جوان کی طرح چھوٹے بڑے خواب دیکھا کرتا ہوں، جو وقت کے ساتھ ساتھ بکھرتے رہتے ہیں۔ مگر میرا سب سے بڑا خواب اُس روز پورا ہو گا جب میرا اپنا گھر ہو گا۔ جہاں ہم ہوں گے، ہمارے بچے ہوں گے اور وہ اِدھر اُدھر

بھاگتے، منع کرنے پر بھی کوئی قیمتی شے گرا کر اُسے توڑ ڈالیں گے۔ مگر ہم صرف بناوٹی غصے کا اظہار کر کے خاموش رہیں گے۔

چند دنوں کے بعد میں نے وِملا کو اپنی زندگی کا ہم سفر منتخب کیا پاسپورٹ کی کاغذی کاروائی مکمل ہونے پر میں اُسے اُس دُنیا میں لے آیا جہاں کی ہر شے، ہر قدر، ہر رواج خود ہی ایک سوال تھا اور خود ہی جواب۔ ابتدا میں اُسے لندن شہر کا ماحول اور اُس کی سوسائٹی کا ہر پہلو بیگانہ لگ رہا تھا۔ تیز گام زندگی، زمین دوز گاڑیاں، بلند و بالا عمارتیں، مقامی لوگوں کی لاتعلقی، اُن کے نفرت آمیز رویے، فٹ پاتھ پر رنگ دار لوگوں کو آتا دیکھ کر فٹ پاتھ بدل لینا، جہازی اسٹور، جرائم اور سب سے بڑی بات برہنہ ماحول کو اُس کا ذہن قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ قدم قدم پر مشرقی اور مغربی تہذیبیں براہِ راست ٹکرا رہی تھیں۔ وہ گھبرائی ہوئی خود کو نئے ماحول میں یکسر اجنبی پا رہی تھی۔ وہ ہر شب مجھ سے شکایت کرتی کہ میں اُسے کس دُنیا میں لے آیا ہوں۔ ممکن ہو تو اُسے واپس بھیج دو یا مناسب سمجھو تو ہم سدا کے لیے انڈیا لوٹ جائیں۔ فیصلہ تم پر چھوڑے دیتی ہوں۔ لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ وقت کے گزرنے پر اُس کی یہ گھبراہٹ، یہ بیگانہ پن، یہ خوف سب دور ہو جائے گا اور وہ نئی زندگی کو آہستہ آہستہ قبول کر لے گی۔

چھ سات ماہ تک میں اُسے لندن کے مختلف مقامات کی سیر کراتا رہا۔ یہاں کی مجموعی زندگی کے اونچ نیچ اور سماجی تضادات سے روشناس کراتا رہا کہ اُس کی سوچ میں وسعت کے ساتھ خود اعتمادی بھی پیدا ہو۔ رفتہ رفتہ میری باتیں اُس پر اس حد تک اثر انداز ہوئیں کہ اُس نے یہاں کے مرکزی دھارے میں جھانکنا شروع کر دیا اور ایک روز مجھے آگاہ کیے بغیر اُس نے ایک سُپر مارکیٹ میں ملازمت اختیار کر لی۔ اُس کے اس آزادانہ اقدام پر میں مطمئن ہو گیا کہ اُس نے نئی زندگی کو قبول کر لیا ہے۔

ہم خوش تھے اور گلے گلے تک ایک دوسرے کی محبت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس دوران ہمارے گھروں سے فون برابر آتے رہے اور وقت بے وقت خط بھی۔ مضمون ایک ہی ہوا کرتا تھا کہ ہماری شادی کو ہوئے ایک سال سے زائد ہو چکا ہے، خوش خبری کب سنا رہے ہو؟ وِملا

خط پڑھ کر اُسے میرے ہاتھ میں تھما دیتی اور سنجیدگی سے کہتی:

''اس کا جواب تمھارے پاس ہے میرے پاس نہیں؟''

مجھے اُس کی دلی آرزو کا پورا پورا احساس تھا۔ مَیں بھی جلد سے جلد باپ بننے کا خواہش مند تھا لیکن کچھ مجبوریاں، کچھ پابندیاں ایسی تھیں جو مجھ کو روک رہی تھیں۔ مَیں نے اُسے سمجھانا چاہا:

''سنو وِملا، تمھیں نئی نئی نوکری ملی ہے۔ اس گھر میں ہمارے علاوہ کچھ اور لوگ بھی رہتے ہیں.... مَیں نہیں چاہوں گا کہ ہمارا بچہ اُن کی نیند خراب کرے۔ یہاں کے لوگ اس بات کو بہت بُرا مانتے ہیں... ممکن ہے مالک مکان ہمیں نوٹس بھی دے ڈالے... پھر اب تم بھی جاننے لگی ہو کہ اُن لوگوں کو رہائش کی جگہ کتنی مشکل سے ملا کرتی ہے جن کے ہاں اولاد ہوتی ہے... عقل مندی اسی میں ہوگی کہ ہم اپنا مکان خرید کر اپنی فیملی شروع کریں۔ جہاں ہمارے بچے کو رونے دھونے کی مکمل آزادی ہو۔''

وِملا نے ایک پتی ورتا عورت کی طرح میری ہر بات کو قبول کرتے ہوئے سر جھکا لیا تھا۔ لیکن مَیں نے اُس پل زیادہ سے زیادہ اوور ٹائم کرنے کی ٹھان لی تھی۔

وِملا نے زندگی کی دوڑ دھوپ میں شامل ہو کر قدم قدم پر میرا ساتھ دینا شروع کر دیا تھا۔ ہماری محنتِ شاقہ کی بدولت ہم نے اپنا مکان خرید لیا تھا۔ فوراً ہی ہم اُسے سجانے سنوارنے میں جُٹ گئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دن بھی آ گیا تھا جب گھر کے در و دیوار مسکرا رہے تھے اور ہر آباد کونا ہمیں مبارکباد پیش کر رہا تھا۔ سارے گھر میں خوشی کی لہر پھیلی ہوئی تھی۔ اُس رات مَیں نے وِملا کو بانہوں میں سمیٹ کر اور اُس کے لمبے لمبے بالوں کو چوم کر کہا تھا:

''ہمارا گھر کتنا بھرا بھرا لگتا ہے۔ صرف ایک چیز کی کمی رہ گئی ہے۔''

اشارہ پانا اُس کے نزدیک معمولی بات تھی، لیکن شرمانے کی بجائے وہ سنجیدہ ہو بیٹھی:

''مگر کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ اگر مَیں ماں بن گئی تو ہمیں کتنی مشکلیں آئیں گی؟''

''مشکلیں تو مرتے دم تک آتی رہیں گی۔ اُن کی کون پرواہ کرتا ہے۔''

''تم کرو نہ کرو۔ مَیں تو کرتی ہوں... مَیں نہیں چاہتی گھر کے علاوہ تم کو تین لوگوں کا بوجھ بھی اُٹھانا پڑے۔''

''تم کیوں فکر کرتی ہو۔ ان بازوؤں میں اب بھی کافی دم ہے۔ پھر کیوں بھولتی ہو کہ ہر آنے والا اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے۔''

مگر وہ میرے جواب سے ذرا بھی مطمئن نہ ہوئی تھی۔ بلکہ اُس نے افسوس ظاہر کیا:

''مَیں حیران ہوں کہ تم لندن میں رہ کر بھی ایک عام ہندوستانی شخص کی طرح سوچ رکھتے ہو۔۔ ذرا سوچو تو، ایک آدمی کی آمدنی میں مکان کی ماہانہ قسط، کونسل ٹیکس، بجلی، گیس، پانی اور ٹیلی فون کے بل مشکل سے نکلتے ہیں۔ پھر بچہ ہونے پر تو گھر کے اخراجات اور بھی بڑھ جائیں گے.... کام کرتے کرتے تمھاری کمر دوہری ہو جائے گی۔''

اُس کی ہر بات میں منطق تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اُس کی ہر بات خود میں صداقت لیے ہوئے تھی۔ لیکن مَیں جانے کیوں اپنی بات پر ڈٹا رہا۔

''اولاد کو پانے کی خاطر کافی کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں پریوار آگے بڑھا کرتے ہیں۔''

''مانتی ہوں اور یہ بھی سچ ہے کہ ماں بننے پر ہی عورت مکمل ہوتی ہے ورنہ وہ جیون بھر ادھوری رہتی ہے۔ مَیں بھی مکمل ہونے کو تیار ہوں، مگر ابھی نہیں۔ دو سال بعد۔''

''دو سال بعد....؟'' مَیں تقریباً چیخ اُٹھا۔

''ہاں۔ اِس دوران ہمیں اتنی رقم جمع کر لینی چاہیے کہ ماں بننے پر اگر مجھے دو ڈھائی برس تک کام نہ بھی کرنا پڑے تو ہمیں کوئی مالی پریشانی نہ ہو۔''

مَیں حیرت زدہ، خاموش، ناقابلِ اعتبار نظروں سے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ اُس نے اپنی بات جاری رکھی:

''مَیں ایک ہندوستانی عورت ہوں، انگریز نہیں۔ جو ماں بننے کے کچھ دنوں بعد بچے کو کسی نینی (NANNY) کے پاس چھوڑ کر کام پر چلی جاتی ہے.... مَیں اپنے بچے کے ساتھ دو ڈھائی برس تک رہنا چاہتی ہوں۔ اُسے بھرپور پیار دینا چاہتی ہوں۔ ورنہ وہ بھی بڑا ہو کر ماں باپ کی پرواہ نہیں کرے گا۔''

اُس کی متوازن سوچ نے مجھے ہر اعتبار سے قائل کر ڈالا تھا۔ مَیں حیرت کا پُتلا بنا سوچ رہا تھا کہ

اُس نے یہاں کا سماجی نظام اور گھریلو مسائل کی پیچیدگیوں کو کتنی ہنر مندی سے سمجھ لیا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی دیرینہ خواہش پر ذاتی جبر کو بھی ترجیح دینے سے گریز نہیں کر رہی ۔ میرے لیے کوئی دوسرا راستہ نہ بچا تھا۔ چاروناچار مجھے بھی اپنا خواب مقررہ وقت کے لیے سینے میں دفن کرنا پڑ گیا۔

گلاس خالی ہو چکا تھا۔ اُٹھ کر نیا جام بنایا۔ گھونٹ بھرتے ہی ذہن پھر سے وِملا کے متعلق سوچنے لگا۔ دو سال کا عرصہ اُس کے لیے عجب ثابت ہوا تھا۔ اُس کی زندگی میں کئی انقلاب آئے اور وہ کئی مراحل سے گزر کر کہاں سے کہاں پہنچ گئی ۔ اُس کے سوچنے کا ڈھنگ کیا بدلا، اُس کے پانو بھی پرائی دھرتی میں دھنس کے رہ گئے تھے۔ غیر معاشرہ قبول کرتے ہی اُس کے خیالات، نظریات اور پہناوا بھی بدل کر رہ گیا تھا۔ شلوار قمیص اور ساڑی کی جگہ اسکرٹ اور جینز نے لے لی تھی۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ایک انگریز خاتون کی طرح پیش آنے لگی ۔ روز بروز اُس کی فرینڈز کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا گیا۔ جس میں زیادہ تر انگریز عورتیں ہی تھیں۔ وہ پابندی سے ہمارے یہاں آنے جانے لگیں۔ وملا اُن کی صحبت میں شاپنگ اور گھومنے پھرنے کی غرض سے چلی جایا کرتی، جس پر مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔ لیکن وِملا کو اُن کے ساتھ گھلتا مِلتا دیکھ کر پریشان کن خیالات میرے ذہن سے گزرا کرتے کہ اگر وہ اسی رفتار سے خود کو بدلتی رہی تو بہت جلد مغربی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہوگی ۔ اُس کے مزاج میں خودمختاری کا جذبہ بھی در آیا تھا اور شخصیت میں انفرادیت کا عنصر بھی پیدا ہو رہا تھا۔

اور ایک شام گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ وملا کو دیکھ کر شدید جھٹکا لگا۔ وہ وہ نہ رہی تھی، جو ہوا کرتی تھی۔ وہ ایک الگ ہی عورت دِکھ رہی تھی ۔ اُس نے اپنے لمبے بال ترشوا کر مختصر کروا لیے تھے۔ مَیں سٹپٹا اُٹھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا:

''یہ کیا کیا تم نے؟''

''کچھ نہیں بال کٹوائے ہیں۔'' اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

''مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا؟''

لیکن میرے سخت لہجے کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ تحمل سے بولی:

''ضروری نہیں کہ ہر بات تم سے پوچھی جائے....انسان کی اپنی مرضی بھی تو ہوا کرتی ہے؟''
جواب سن کر مَیں تڑپ اُٹھا تھا۔ تپتے دماغ کے ساتھ ہی گویا ہوا:
''آخر تم کو ہوتا کیا جا رہا ہے؟....تم آئے دن بدلتی جا رہی ہو؟''
''اس میں حرج بھی کیا ہے....اب ہمیں یہاں رہنا ہے۔ یہاں کی زندگی کو اپنانا چاہیے....مَیں تو تم سے بھی کہوں گی، خود کو بدل ڈالو....زمانے کے ساتھ چلو۔''
''کان کھول کر سن لو وملا۔ مَیں اوپر سے نیچے تک انڈین ہوں اور انڈین ہی رہوں گا۔''
''اسی کارن تم یہاں کے لوگوں سے مل نہیں پاتے۔ اُن سے پرے پرے رہتے ہو، جیسے وہ تمھیں کھا جائیں گے۔''
مَیں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ذاتیات کی سطح پر اُتر آئے گی۔ اس قدر بے باک اور گستاخ بھی ہو جائے گی۔ اس کی ذاتی چوٹ نے میرے مردانہ وقار کو اتنا گہرا صدمہ پہنچایا تھا کہ من میں آیا، آگے بڑھ کر تین چار بھرپور چانٹے اُسے رسید کروں اور بتاؤں کہ مقامی لوگوں سے دور رہنے کی وجہ وہ نہیں جو تم سوچا کرتی ہو۔ مقامی لوگ ہمیں دل سے قبول نہیں کرتے۔ ہمیں کم تر سمجھ کر فاصلہ رکھتے ہیں۔ لیکن مَیں اُس سے کچھ بھی نہ کہہ پایا۔ غصہ پی کر، ہونٹ کاٹتا ہوا چپ چاپ دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔
شدید جھڑپ کے بعد گھر میں تناؤ پیدا ہونا فطری امر تھا۔ ہم کھنچے کھنچے سے ایک دوسرے سے یوں پیش آتے، گویا ہم میاں بیوی نہ ہوں، الگ الگ کشتیوں کے مسافر ہوں جن کی کشتیاں الگ الگ دھاروں پر بہہ کر ایک ہی منزل کی طرف رواں ہوں۔ میری کوشش جاری تھی، کہ وہ اپنا دھارا بدل کر میرے قریب چلی آئے اور مجھ کو پہلی سی محبت، چاہت اور نظر سے دیکھے۔ مگر اُسے نئے دھارے پر بہہ کر آنند مل رہا تھا۔ وہ خوشی سے جھومتی پھرتی تھی۔ جب کبھی اُس کی کوئی فرینڈ ہمیں ڈرنک پارٹی میں مدعو کرتی، تو وہ بلا کسی ہچکچاہٹ کے دعوت قبول کر لیتی اور مجھے بھی ساتھ چلنے پر مجبور کرتی۔ یوں بھی مَیں اُسے کاک ٹیل پارٹیوں میں اکیلا چھوڑنے پر آمادہ نہ تھا۔ مجھے اُن پارٹیوں کا خاصا تجربہ تھا، جہاں شراب کا دور چلنے پر مردوں کی آنکھوں میں عورتیں سراپا گھومنے لگتی

ہیں اور عورتیں بھی ادھر اُدھر جھانک کر بے جا مسکراہٹیں بکھیر نے لگتی ہیں۔ مگر وملا اسی خیال میں تھی کہ میں پارٹیوں میں شرکت کر کے خود کو بدل رہا ہوں۔ میں نے اُس کی خوش فہمی کو دور کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جب کبھی کوئی پارٹی ہوتی، خواہ وہ ہمارے ہاں ہو یا کسی اور کے۔ وملا مہمانوں کے ساتھ گرمجوشی سے پیش آ کر یہی احساس دلاتی کہ پارٹی کی میزبان وہی ہے۔ لوگوں سے الگ الگ موضوع پر گفتگو کر کے، سلجھے ہوئے مذاق کے ساتھ قہقہے لگانا اور کسی بھی اجنبی کے ساتھ ناچنا اُس کا معمول بن گیا تھا۔ اُسے مکمل بدلا ہوا پا کر ایک ہی سوال میرے ذہن میں اُٹھا کرتا تھا کہ آیا یہ وہی عورت ہے، جس کی سادگی، معصومیت اور شرمیلے پن پر میں مرمٹا تھا اور جس کی نگاہیں بات کرتے سمے اُٹھا نہ کرتی تھیں۔ مگر اب تو اُس کی زندگی کا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ مجھے حیرت بھی ہو رہی تھی اور افسوس بھی۔ تراشے ہوئے بال، گاڑھا میک اَپ، مغربی لباس اور مخصوص انگریزی لب ولہجہ۔ اگر اُس کے ماں باپ اُس کے رنگ روپ کی ایک جھلک بھی پالیں تو یقیناً اُن کو کتنا دُکھ ہو گا؟ ممکن ہے وہ اپنی اولاد کو پہچان بھی نہ پائیں؟ اور مجھ سے پوچھتے پھریں کہ وملا کہاں ہے؟

ان دنوں ایک ہی احساس میری شخصیت کو اپنی گرفت میں جکڑے رہتا تھا کہ وِملا کے جیون کی ڈور میرے ہاتھوں سے چھوٹی جا رہی ہے اور میں جس قدر اُسے پکڑنے کی کوشش کرتا ہوں اُسی قدر وہ پھسل جاتی ہے۔ لیکن میرے باطن میں اُس کے واسطے کوئی تلخی، نفرت یا علیحدہ ہونے کا جذبہ پیدا نہ ہوا تھا۔۔ بلکہ میں اُسے ٹوٹ کر چاہنے لگا تھا۔ وملا کو میری کمزوری کا پورا پورا احساس تھا اور وہ میری کمزوری کا غالباً فائدہ بھی اُٹھا رہی تھی۔ لیکن گذشتہ چند دنوں سے پریشانی نے اُسے گھیر رکھا تھا۔ وہ ہر پل کھوئی کھوئی سی رہتی، گہری فکر میں ڈوبی دِکھائی دیتی۔ میں دریافت کرتا تو وہ حیلہ حوالہ بنا کر ٹال جاتی۔ لیکن مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ کوئی انوکھی بات اُس کی زندگی میں ضرور واقع ہوئی ہے جس نے اُس کی شخصیت کو اُلجھا ڈالا ہے۔

اور ایک سہانی شام جسے میں شاید ہی اگلے جنم تک بھلا پاؤں گا۔ گھر پہنچ کر میں نے حسبِ معمول چائے بنانا چاہی۔ اُسی پل لاؤنج سے وِملا کی آواز آئی:

''چائے بعد میں بنالینا۔ مجھے تم سے نہایت ضروری بات کرنی ہے۔''
مجھے لاؤنج میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ صوفے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ تھکی تھکی، بجھی بجھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ چہرہ بھی کافی اُترا ہوا تھا۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ صرف پھیل کر رہ گئے۔ کسی غیر معمولی بات کا دباؤ اُس کی آواز پر بھاری تھا۔ چند خاموش، بے ضرر لمحے ہمارے درمیان گزر گئے اور ہم بے وجہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ بے ساختہ اُس کے ہونٹوں سے نکلا:
''مَیں ماں بننے والی ہوں۔''
یہ سننا تھا کہ آگے بڑھ کر بے تحاشا مَیں اُس سے لپٹ گیا اور بے اختیار اُسے چومنے لگا۔ نوزائیدہ بچے کی آوازیں میرے کانوں میں گونج اُٹھیں۔ مَیں خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا اور دیوانہ وار اُس کا انگ انگ چوم رہا تھا۔ مگر اُس کا بدن بے حرکت، بے جنبش اور کسی ردِعمل کے بغیر رہا۔ لگا کہ مَیں کسی تراشے ہوئے بُت سے لپٹا ہوا ہوں۔
''جانتی ہوں تم بہت خوش ہو، لیکن مَیں نہیں۔''
کیوں؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟''
''مَیں ابھی ماں بننا نہیں چاہتی۔''
''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ ہوش میں تو ہو؟''
''بالکل ہوش میں ہوں.... اور یہ فیصلہ بھی مَیں نے سوچ سمجھ کر کیا ہے۔''
جھٹکا لگتے ہی مَیں اُکھڑ گیا۔
''لیکن تم نے خود ہی کہا تھا کہ دو سال بعد تم ماں بننا پسند کرو گی۔ اب تمھیں کیا تکلیف ہے؟''
''ابھی میری عمر ہی کیا ہے؟ مَیں نے زندگی میں ابھی دیکھا ہی کیا ہے؟.... پہلے مجھے جی بھر کے دُنیا دیکھ تو لینے دو۔ کچھ انجوائے (ENJOY) تو کر لینے دو؟ ماں بننے کو تو ساری عمر پڑی ہے۔''
''یہ سوچ تمھاری نہیں ایک یورپین لڑکی کی ہے۔ جو ذاتی آزادی کی خاطر اپنی اولاد کو بھی قربان کرنے سے نہیں چوکتی۔''
''تم کچھ بھی سمجھ لو.... ماں بن کر یہی چار دیواری میری دُنیا بن کر رہ جائے گی۔ مجھے اس احساس

سے ہی گھٹن ہونے لگتی ہے.... نہ میں کہیں جا پاؤں گی اور نہ کسی سے مل پاؤں گی۔''
''مگر اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ تمھارا پاؤں بھاری ہو چکا ہے اور میرا خواب پورا ہونے والا ہے۔''
وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر آہستہ سے بولی:
''تمھیں دُکھ تو ضرور ہوگا، پر میں مجبور ہوں۔ میں ڈاکٹر سے ملنا چاہتی ہوں۔ چاہوں گی کہ تم بھی میرے ساتھ چلو۔''
میں سکتے میں آ گیا۔
''سنو وِملا۔ اس بچے پر جتنا تمھارا حق ہے، اُتنا میرا بھی ہے۔ مگر جو قدم تم اُٹھانا چاہ رہی ہو وہ سراسر گناہ ہے.... اور میں اس گناہ میں تمھارا ساتھ ہرگز نہیں دوں گا۔ ورنہ زندگی بھر خود کو گناہ گار سمجھوں گا۔''
''تم صدیوں پرانی باتیں کرتے ہو۔ آج زمانہ بدل چکا ہے... کل تک جو بات مذہب کے خلاف سمجھی جاتی تھی، وہ آج انسان کی ضرورت بن کر رہ گئی ہے۔ اِس دور میں انسان کے ذاتی حالات اور اُس کی خواہشات کو سب سے پہلے دیکھا جاتا ہے۔ باقی چیزیں بعد میں آتی ہیں۔''
''میں تمھارے خیالات سے قائل ہونے والا نہیں... میں کسی بھی حالت میں اپنے بچے کا خون ہونے نہیں دوں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''
''اگر یہی تمھارا فیصلہ ہے تو ٹھیک ہے... میں ماں ضرور بنوں گی... بچہ بھی تمھیں ضرور ملے گا۔ مگر تم مجھ کو ہاتھ سے کھو بیٹھو گے، سدا کے لیے... میں تمھاری خوشی کی خاطر اپنی خوشیاں قربان نہیں کر سکتی۔ فیصلہ تم پر چھوڑے دیتی ہوں صبح تک بتا دینا۔''
یہ کہہ کر وہ بیڈروم کی طرف بڑھ گئی تھی۔ اُس نے دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ مکان کی دیواریں لرز اُٹھی تھیں۔

گلاس خالی ہو چکا تھا۔ نیا جام بناتے ہوئے خیال آیا کہ اِس خودساختہ گھر کو بم سے اُڑا دوں جس کا دھماکا اتنے زور کا ہو کہ اُس کی آواز ہسپتال کے بستر تک پہنچے۔

☆☆

ٹھکانا

مَیں نے جھوٹ کو سچ میں اتنی ہنرمندی سے شامل کر رکھا تھا کہ میرا ادا کردہ ہر جملہ، ہر بول میرے مقابل بیٹھے ہوئے افسر پر اپنا تأثر اتنی شدت سے چھوڑ رہا تھا کہ وہ میرے چہرے سے آنکھیں ہٹانے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ بلکہ وہ میری ہر بات کو دھیان سے سن کر اِس اُدھیڑبُن میں تھا کہ اُسے میرے متعلق کیا فیصلہ کرنا ہے؟ مَیں خوش تھا کہ میرا چلایا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھ رہا ہے اور جس مقصد کے تحت مَیں مقامی کونسل کے دفتر میں بیٹھا اپنے نجی حالات اور مسائل بیان کر رہا ہوں، کامیابی یقیناً میری ہوگی۔

اور جب مَیں اپنے تمام تیر چلا کر ترکش خالی کر چکا تو افسر نے میری فائل اُٹھا کر کاغذات دیکھنا شروع کر دیے۔ کچھ اس ڈھنگ سے کہ مَیں موجود تو ہوں اور نہیں بھی۔ درحقیقت مجھے اپنے قیام کی خاطر کشادہ جگہ درکار تھی، جہاں سانس لینے پر مجھے احساس ہو کہ مَیں واقعی زندہ ہوں۔ یوں تو مَیں مرکزی لندن کے ایک بیڈ اینڈ بریک فاسٹ کے مختصر سے کمرے میں مقیم تھا اور اُس کے تمام اخراجات کونسل ہی برداشت کر رہی تھی۔ لیکن وہ کمرہ اس قدر تنگ تھا کہ کسی

دوسرے شخص کی موجودگی میں دونوں افراد سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ کون کہاں بیٹھے اور کون کھڑا رہے؟ ایک تو کمرہ چھوٹا اُس پر ستم یہ کہ مَیں نے غیر ضروری کوڑا کرکٹ وہاں جمع کر رکھا تھا جو پلائی ووڈ کی دیواروں سے لگا کھڑا تھا اور بعض دفعہ توازن کھو دینے پر بستر پر پھیل جایا کرتا تھا۔ ایک بار تو حد ہو گئی۔ مَیں اور میری گرل فرینڈ اکبرے بستر پر بدنی کھیل کھیلنے میں مشغول تھے کہ جانے کس کی ٹانگ دیوار سے جا ٹکرائی کہ اگلے پل ہی سامان اور اُس پر رکھے ہوئے برتن ہم پر پھیل گئے اور ہم سرد ہو کر رہ گئے۔ اکثر میری گرل فرینڈ مذاقاً کم اور طنزاً زیادہ کہا کرتی:

''کبوتر کو بھی اپنے ڈربے میں چکر کاٹنے کی پوری آزادی ہوتی ہے ...مگر تم تو کبوتر سے بھی گئے گزرے ہو۔''

''کیا کروں...مجبور ہوں۔''

''یہ مجبوری تم نے خود پال رکھی ہے۔''

''ممکن ہے....لیکن مَیں اپنے ڈھنگ سے جینا چاہتا ہوں۔''

''مَیں تمھارے اس رویے سے ہمیشہ ناخوش رہی ہوں۔''

اُن دنوں مَیں ریاست کا داماد بنا بے فکری سے آزاد معاشرے میں گھوم پھر رہا تھا۔ نہ کوئی پوچھنے والا تھا اور نہ ہی کوئی تنقید کرنے والا۔ سوائے میری گرل فرینڈ کے، جو موقع بے موقع مجھ پر چوٹ کر دیا کرتی تھی۔ لیکن مَیں بے ضرر سی مسکراہٹ کے ساتھ اُسے نظر انداز کر ڈالتا۔ مجھے ہر ہفتے سرکاری خزانے سے اتنی رقم مل جایا کرتی کہ روزمرہ کی ضروریات کھینچ تان کر پوری ہو جائیں۔ لہٰذا ملازمت کرنا میرے نزدیک بے معنی سا تھا۔ کون آٹھ آٹھ گھنٹوں تک ایک ہی کرسی پر اکڑوں بیٹھا فائلوں اور کمپیوٹروں سے سر کھپاتا پھرے؟ کون بلاناغہ دماغ کا گودا خشک کرتا پھرے؟ پھر ہر شام تھکا ماندہ نچڑا ہوا گھر لوٹے...؟ اور اگلے روز منہ اندھیرے جاگ کر ٹھیک وقت پر دفتر پہنچے؟ مَیں تو اپنی مرضی سے اُٹھنے بیٹھنے اور سونے جاگنے کا عادی تھا۔ کوئی بندش، پابندی یا دباؤ برداشت کرنا میرے کردار کے خلاف تھا۔ اصل مقصد تو زندہ رہنا تھا، سو مَیں جی رہا تھا۔ کبھی ہنسی خوشی اور کبھی رو دھو کر۔ دراصل سابق ملازمت چھوٹنے پر میرے ہاں کئی تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں۔ ایک تو

یہ کہ زندگی بھر کسی کے ماتحت کام نہیں کروں گا۔ اگر مجبوراً کام کرنا بھی پڑا تو اپنا مالک میں خود رہوں گا۔ لیکن گاہے گاہے میرے ذہن کی نچلی سطح سے یہ آواز بھی اُبھرا کرتی کہ مَیں اپنی ذات ہی نہیں، اپنی جوانی کو بھی ضائع کر رہا ہوں، جس کے گزرنے پر مَیں ہاتھ ملتا رہ جاؤں گا اور تادمِ آخر پچھتاتا ہوا دُنیا سے رخصت ہوں گا۔ یہ بھیانک احساسات جان لیوا ثابت ہوتے اور مَیں راہ پیائی کرتے وقت اکثر سوچتا کہ کیا مجھے اپنا گھر بنانے، بسانے اور اُسے آباد کرنے کا موقع کبھی نصیب ہوگا یا نہیں۔ یہ خیال مجھے خود سے الگ کر ڈالتا اور مَیں خود کو نہایت چھوٹا محسوس کرتا۔ گویا میرا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ لیکن مَیں بڑی چالاکی سے ذہن کو جھٹک کر تخیل کی دُنیا میں پناہ ڈھونڈ لیتا۔ بعض دفعہ دیکھتا کہ کسی دریا کنارے، ایک سرسبز ٹیلے پر میرا عالیشان مکان واقع ہے شام کا وقت ہے۔ ہلکا ہلکا دھندلکا پھیلا ہوا ہے اور آکاش قدرے جھک آیا ہے۔ مَیں تھکا ماندہ کام سے لوٹ رہا ہوں۔ میرے ہاتھوں میں آئس کریم، چاکلیٹ، کیک، انڈے، گوشت اور ترکاریوں سے بھرے ہوئے تھیلے ہیں۔ بچے مجھے دیکھتے ہی پوری رفتار سے میری طرف دوڑتے ہیں۔ اپنے ہاتھ تھیلیوں کی طرف بڑھا کر اُنھیں چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن مَیں تھیلے کو آکاش کی طرف اُٹھا کر کہتا ہوں:

''چلو بچو اندر چلو... آج تمھارا ڈیڈ بہت سی چیزیں لایا ہے.... مگر سب تمھاری ماں کی موجودگی میں تقسیم ہوگا..... جی بھر کر کھاؤ اور عیش کرو۔''

اچانک کسی کار، ٹرک، موٹر سائیکل یا بس کا تیز ہارن سن کر مَیں اُچھل پڑتا۔ عموماً دیکھتا کہ مَیں فٹ پاتھ چھوڑ کر سڑک پر آتی جاتی ٹریفک کے درمیان مذاق بنا بیٹھا ہوں۔ ڈرائیور تو کجا، راہ گیر بھی میرا ڈھیلا ڈھالا بے ترتیب لباس، بکھرے ہوئے لمبے لمبے بال، سانولا رنگ، خود سے باتیں کرتا ہوا اور فضا میں اُلٹے سیدھے ہاتھ چلاتا دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔ مَیں بھی اُن کے ساتھ ہنس دیتا۔

اور ایک شام مَیں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ ایک انگریزی ڈھابے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اُسے کسی اچھے ریستوراں میں لے جانا میری توفیق سے باہر تھا۔ ہمارے پیالوں کے

درمیان فرنچ فرائز (French fries) کی پلیٹ بھی رکھی تھی۔ اُس پر میری گرل فرینڈ کی انگلیاں پھرتی سے چل رہی تھیں۔ غیر متوقع مَیں نے اُس سے کہا:

''مَیں نے فیصلہ کیا ہے، بہت جلد گھر بساؤں گا۔''

''تمھارا خیال بڑا نیک ہے۔''

''اور مَیں نے یہ بھی فیصلہ کیا ہے، بہت جلد شادی کروں گا۔''

''تمھارا یہ خیال بھی بڑا نیک ہے۔''

یہ سن کر ایسا لگا کہ جنت میں فرشتوں نے میری اور اُس کی شادی گرہ مضبوطی سے باندھ دی ہے اور اب کوئی طاقت بھی اُسے کھول کر ہمیں الگ نہیں کر سکتی۔ مَیں اپنی ذات میں چوڑا ہو کر ڈھابے میں موجود ہر گاہک کو ایک فاتح کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ وہ لوگ بھی اپنی بھنویں اوپر نیچے کیے میرا جائزہ لینے لگے۔ لیکن مجھے اُن کی کیا پرواہ تھی۔ اتنے میں میری گرل فرینڈ نے لبوں سے پیالہ ہٹا کر کہا:

''بُرا مت ماننا...تم سے وہی عورت شادی کرے گی، جب اُسے یقین ہو جائے گا کہ تمھارے پاس نوکری کے ساتھ رہنے کو مناسب ٹھکانا بھی ہے۔''

''اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟''

''کوئی بھی عورت تم سے شادی نہ کرے گی۔ چاہے وہ تم سے محبت کیوں نہ کرتی ہو۔''

لیکن میری گردن اور کندھے برابر اونچے رہے۔

'' فکر مت کرو.....اُس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔''

''کب.....اگلے جنم میں؟''

''نہیں بہت جلد۔ تم دیکھتی جاؤ مَیں کیا کرنے والا ہوں.....اُکھاڑ کر رکھ دوں گا۔''

جملے کا آخری ٹکڑا، جس میں میری شیخی بھی شامل تھی۔ سن کر وہ دیر تک ہنستی رہی۔ پھر ہنستے ہی گویا ہوئی:

''لمبے عرصے سے یہی سنتی چلی آ رہی ہوں.....مگر آج تک تم نہ کسی کا کچھ اُکھاڑ سکے اور نہ بگاڑ سکے۔ بلکہ کبوتر خانے میں پڑے خود کو ضائع کر رہے ہو.....حالاں کہ پڑھے لکھے ہو۔ دُنیا کو سمجھتے

ہو۔ چاہو تو بہت کچھ کر سکتے ہو۔''

''جانتا ہوں.... مگر اس بار تم کو نراش نہیں کروں گا... یہ طے ہے۔''

افسر میری فائل کا ہر صفحہ بغور دیکھ چکا تھا۔ اُسے میز پر پھینک کر وہ تولتی ہوئی نظروں سے مجھے برابر دیکھتا رہا۔ شاید وہ میرا ایکسرے کرنے کی سوچ رہا تھا۔ مَیں کانپ اُٹھا۔ لگا کہ وہ میرے خود ساختہ جھوٹ سے واقف ہو چکا ہے یا اُس سے مطمئن نہیں ہوا۔ بولا:

''تمھارے حالات تو ذرا بھی نہیں بدلے ...وہی ہیں جو دو برس پہلے تھے۔یعنی تم اکیلے ہو۔ بے روزگار ہو... کمرہ کونسل کی طرف سے ملا ہوا ہے ...وہ چھوٹا ضرور ہے مگر اُس میں کم از کم سِنک (Sink) تو لگا ہوا ہے۔''

''جہاں مَیں صرف دانت صاف کر سکتا ہوں۔''مَیں نے تلخ ہو کر کہا:''ٹائلیٹ کے واسطے مجھے باہر جانا پڑتا ہے جو برآمدے میں کچن اور باتھ روم سے جڑا ہوا ہے...وہاں لمبی قطار بھی لگا کرتی ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ اُس منزل پر دوسرے لاجر بھی رہتے ہیں۔ اُنھیں کوئی شکایت نہیں؟''

مَیں نے فوراً پینترا بدلا اور بدلنے میں ہی عافیت تھی۔

''مَیں اپنی پرابلم بیان کر چکا ہوں...میری گرل فرینڈ جو میری منگیتر بھی ہے۔وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ساتواں مہینہ چل رہا ہے۔ مجھے فوراً بڑی جگہ چاہیے جہاں مَیں اُس کی دیکھ بھال کر سکوں۔''

اُس کے چہرے پر ویسی ہی سوچی سمجھی مسکراہٹ اُبھر آئی تھی جو پہلی بار میری پرابلم سننے پر اُبھری تھی۔ فائل سے گردن اُٹھا کر بولا:

''مَیں پہلے بھی تم سے کہنا چاہتا تھا۔کونسل صرف تمھاری ذمہ دار ہے۔تمھاری گرل فرینڈ کی نہیں۔''

''مت بھولو اِس کڑے وقت میں میری گرل فرینڈ کو میری سخت ضرورت ہے اور مجھے اُس کی۔ تم خود سوچو وہ کبوتر خانے میں آ کر کیسے ٹھہر سکتی ہے؟''

تمھاری اِس بات میں منطق ہے۔اس پر غور کیا جائے گا۔''

''کب، جب مَیں کبوتر خانے میں دم توڑ دوں گا؟''
''نہیں جب تمھارے حالات بدلیں گے... یعنی تمھارے باپ بننے پر ہی کونسل تمھاری مدد کرسکتی ہے۔ ورنہ نہیں۔''
مجھے طیش آ گیا۔ ''مت بھولو اِس پل بھی میرے بچے اور اُس کی ماں کو میری سخت ضرورت ہے... اگر ماں یا بچے کو کچھ ہو گیا تو مَیں کونسل پر مقدمہ دائر کر دوں گا۔'' یہ کہہ کر مَیں کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرے خطرناک تیور دیکھ کر اُس کا محتاط ہونا فطری امر تھا۔ فکر میں ڈوبا کچھ دیر سوچتا رہا۔ مَیں نے ایک بار پھر پینترا بدلا اور نہایت نرم لہجہ اختیار کیا:
''مَیں پچھلے دو برسوں سے تم لوگوں کے ساتھ کوآپریٹ کر رہا ہوں اور مَیں نے اُف تک نہیں کی ....لیکن اب تمھاری باری ہے۔''
میرے چہرے کے آتے جاتے رنگ دیکھ کر اُس کے تیور بھی کچھ کچھ بدلے۔ فائل اُٹھا کر اُس نے پہلے صفحے پر چند فقرے درج کیے اور مہذب انداز میں گویا ہوا:
''مَیں سمجھ سکتا ہوں، تم پریشان ہو.... ہم جلد تم کو خط لکھیں گے۔''
فائل سمیٹ کر وہ کھڑا ہو گیا اور مجھے دیکھے بغیر کیبن سے چلا گیا۔ لیکن میرا اندرون بلیوں اچھل کر مجھے یقین دلا رہا تھا کہ میرے چلائے ہوئے تیر خطا نہیں گئے۔

ٹاؤن ہال سے نکل کر میں نے خود کو چبوترے کے گول گول اونچے ستونوں کے درمیان کھڑا پایا۔ میں ایک ستون کا سہارا لے کر تکونی سیڑھیوں کی ایک سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگا کر دو تین زوردار کش لیے اور دھواں اگل کر راحت کا گہرا سانس لیا۔ خیال آیا کہ جھوٹ کے تو پانو ہی نہیں ہوا کرتے۔ لیکن میں نے تو آج کمال ہی کر دیا۔ خود پر حیران بھی تھا جس انداز سے میں نے اپنے من گڑھت مسائل بیان کیے تھے اور جس انداز سے ایک مشاق اداکار کی طرح اداکاری کی تھی، وہ بے نظیر تھی۔ افسر بھی چکر کھا گیا تھا۔ میرے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ میں جھوٹ کی اس سطح کو بھی چھو سکتا ہوں۔ گو کہ جھوٹ بولنا میری سرشت میں بچپن سے شامل تھا۔ لیکن اس

ڈرامائی اور خطرناک حد تک میں کبھی نہ گیا تھا۔ مجھے اندیشہ بھی تھا کہ اگر میری گرل فرینڈ کو سچائی کا علم ہو گیا تو اس کی نظر میں میرا وقار جاتا رہے گا۔ جھوٹ کو وہ اخلاقی گراوٹ سمجھتی ہے اور مجھے بھی سدا سچ بولنے کی تلقین کیا کرتی ہے کہ سچ ہی اس کے نزدیک دُنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ پریشان ہو کر میں نے ایک اور جان دار کش لیا۔ خیال آیا کہ اگر میں نے یہ خطرناک کھیل کھیلا بھی ہے تو اس میں میری گرل فرینڈ بھی شامل ہے۔ پدماسچد یوا مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میرے ساتھ جیون گزارنے کا ارادہ بھی رکھتی ہے۔ وجہ وہ یہ بتاتی ہے کہ میں نے اسے کبھی دھوکہ نہیں دیا۔ جبکہ اس کے سابق بوائے فرینڈ پیاس بجھا کر اسے ڈمپ (DUMP) کر گئے تھے۔ وہ میرے شریر کے ساتھ میری آتما سے بھی پیار کرتی ہے۔ میری پیشانی کو چومتے ہوئے وہ یہ جواز پیش کرتی ہے کہ شاستروں کے انوسار ہماری آتما جنم سے مرن تک ہمارے ماتھے کے درمیان قائم رہتی ہے۔ شاستروں کا ذکر اُس کی زبانی سن کر مجھے بڑا اچنبھا ہوتا ہے کہ اُس نے اپنے ماں باپ کی چھوڑی ہوئی دھرتی کو دور سے بھی نہیں دیکھا۔ وہ پردیس میں پیدا ہوئی، وہیں کی اقدار، روایات اور طرزِ زندگی کے سہارے پلی بڑھی لیکن اُس کے عمر رسیدہ والدین نے اُسے اپنی سنسکرتی، دھرم اور ریتی رواج کی بابت کئی درس دے رکھے ہیں۔ وہ گاہے گاہے مجھ سے اُن موضوعات پر بات کر کے ہندو دیو مالا اور دیوی دیوتاؤں کے قصے بھی سنا کرتی ہے۔ مَیں بھی مہاتما بدھ، نانک، کبیر اور گاندھی جی کی دھرتی چھوڑ کر پردیس میں چلا آیا تھا۔ جب رُوٹی اور منہ کے درمیان فاصلہ برابر قائم رہے تو ہر کوئی کسی دوسرے ٹھکانے پر جا کر قسمت آزماتا ہے۔ مَیں بھی اُن میں سے ایک تھا۔

پدما خود مختار ہونے کے علاوہ برسرِ روزگار بھی ہے۔ کوئی وقت تھا کہ وہ بھی میری طرح بے کار تھی اور ادارہ سوشل سکیورٹی کے چکر کاٹا کرتی تھی۔ وہیں اُس سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ پھر سلسلہ چل نکلا اور ایسا چلا کہ وہ تا حال جاری ہے.... اور ایک بار ہم ابتدائی دنوں میں بے روزگاری کے دفتر سے مقررہ دن کے مقررہ وقت پر دستخط کر کے باہر آئے تو میرے دریافت کرنے پر کہ وہ کہاں مقیم ہے؟ اگر اُس کی قیام گاہ قریب ہی میں واقع ہے تو ہم بات چیت کرتے ہوئے اُس

سمت قدم بڑھا سکتے ہیں؟ چلتے چلتے وہ اچانک رُک گئی پلکیں جھپکائے بنا مجھے دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے میرا اعتماد بڑھانا چاہا:

''تم میرے نئے دوستوں میں سے ہو اور مَیں دوستوں سے کوئی بات چھپانا پسند نہیں کرتی۔ یہ میرے کردار کا اہم پہلو ہے۔ مَیں ان دنوں YMCA میں ٹھہری ہوئی ہوں۔''

پھر دورانِ گفتگو انکشاف ہوا کہ وہ اپنے والدین سے ناراض ہو کر وہاں رہنے کو چلی آئی ہے۔ وجہ اُس نے یہ بتائی کہ اُس کے ماتا پتا ایک لمبے عرصے سے اس ملک میں آباد ہیں مگر وہ یہاں کے بنیادی ڈھانچے، مرکزی دھارے، طرزِ زندگی اور کلچر کو نہیں سمجھ پائے۔ اگر وہ خود جنریشن گیپ کو سمجھ سکتی ہے تو اُن کو بھی کچھ کچھ محسوس کرنا چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، پیچھے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ناسٹالجیا سے نجات پانا اب اُن کے لیے ممکن نہیں رہا۔ ایک ڈھلتی رات میں جب وہ اپنے ایک سفید فام دوست کے ساتھ کلب میں وقت گزار کر دیر سے لوٹی تو اُس کے ماں باپ کو بہت بُرا لگا۔ اُن کے درمیان سخت تکرار ہوئی۔ بات یہاں تک پہنچی کہ پدما اپنے حواس کھو بیٹھی۔ وہ چیختی چلاتی، اپنا ضروری سامان سمیٹ کر، گھر کا دروازہ قریب قریب توڑ کر چلی گئی۔ بزرگ رات بھر پریشان رہے اور اُس دن کو کوستے رہے جب انھوں نے وطنِ عزیز کو خیر باد کہا تھا۔ لیکن ابھی تڑکے کا نور بھی نہ پھیلا تھا کہ پدما نے ماں باپ کو فون پر آگاہ کر دیا کہ وہ اس سمے کہاں ہے اور اُس نے رات کہاں بسر کی ہے۔ تب کہیں بوڑھے بدنوں میں جینے کے آثار لوٹ آئے تھے۔

ضعیف والدین اپنی اولاد سے دور رہنے کا تصور کب تک اور کہاں تک کر سکتے ہیں۔ پدما کے والدین بھی اپنی بیٹی کی طرزِ زندگی اور اُس کے رویوں کے آگے جھک گئے۔ پدما ان شرائط پر گھر لوٹ آئی کہ آئندہ کوئی اُس کی ذاتی زندگی میں دخل نہیں دے گا۔ وہ کسی بھی وقت، کسی بھی دوست کے ساتھ باہر جائے یا لوٹے، اس پر کوئی روک تھام، کوئی کرفیو عائد نہیں ہوگا۔ وہ چوں کہ بالغ ہے، تعلیم یافتہ ہے اور ذہین بھی۔ وہ اپنے حقوق کو سمجھتے ہوئے اپنی دیکھ بھال خود کر سکتی ہے۔

''تم نے اچھا کیا جو گھر واپس چلی گئیں... تم کیا جانو ماں باپ کا سایہ کیا ہوتا ہے؟''
اُس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ لیکن مَیں نے اُسے سمجھاتے ہوئے ایمانداری سے کہا:
''ماں باپ اچھے بُرے وقتوں میں سدا اولاد کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہر مصیبت میں اُن کے کام آتے ہیں۔ اپنا پیٹ کاٹ کر اُن کی پرورش کرتے ہیں۔''
یہ تمام پہلو اُس کے واسطے قدرے نئے تھے۔ وہ سرِ راہ مجھ سے بے اختیار لپٹ گئی۔ بلکہ اُس نے اپنے پانو میرے جوتوں پر رکھ کر اپنا بوٹا قد بڑھانا چاہا۔ پھر میرے گلے میں بازو ڈال کر میرا منہ چوم لیا اور بعد میں میرا ماتھا بھی۔

اور ایک سرد صبح جب پہلا پہر دم توڑنے کے قریب تھا۔ آنکھ کھلنے پر مَیں نے دیکھا کہ کمرے کی چوکھٹ کے پاس خاکی رنگ کا ایک لفافہ پڑا میرا انتظار کر رہا ہے۔ خط کونسل کی طرف سے آیا تھا۔ لکھا تھا:
ڈیر گووِند کھنہ۔
کونسل افسوس کے ساتھ یہ خط لکھ رہی ہے کہ ایک لمبے عرصے تک تمھیں بیڈ اینڈ بریک فاسٹ میں رہنا پڑا۔ جب کہ کونسل کا ارادہ تھا کہ وہاں تمھیں چند ہفتوں کے لیے رکھا جائے۔ ہم کو اپنی غلطی کا احساس ہے۔ لہٰذا کونسل نے فیصلہ کیا ہے کہ تم کو وَن بیڈ روم فلیٹ فوراً مہیا کیا جائے۔ اس سلسلے میں تم مسٹر گولڈ اسمتھ سے فوراً ملو۔
مَیں جوں جوں خط کی سطریں پڑھتا جا رہا تھا، توں توں میرے ہاتھوں کی لرزش بڑھتی جا رہی تھی۔ بلکہ خط کا مضمون بھی ٹھیک ٹھیک سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دوبارہ پڑھنے پر ہی واضح ہوا کہ مَیں اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ خط چوم کر اور اُسے چھت کی طرف اُچھال کر مَیں ناچنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مَیں اپنے جیون کو سنوارنے کی بنیاد رکھ چکا ہوں اور اب میدان ہر اعتبار سے میرا ہے۔
اور ایک شام مجھے پدما سے ملنا تھا۔ ویک اینڈ کا آغاز ہو چکا تھا۔ پانچ روز تک عرق ریزی کرتے کرتے پدما کو اس شام کا بے صبری سے انتظار رہا کرتا۔ وہ تو یہاں تک کہا کرتی کہ ہر شام

فرائی ڈے کی شام کیوں نہیں ہوتی؟ مَیں اُس کے دل پسند پب میں داخل ہوا تو وہاں ہنگامہ بپا تھا۔ ہر طرف لوگ پھیلے ہوئے تھے۔ سفید، کالے اور سانولے۔ قہقہے، ہنسی، مذاق، آوازیں، پینا پلانا، حسن اور دھواں ہر کونے سے اُٹھ رہا تھا۔ مدھم موسیقی بھی کہیں سے اُبھر کر ماحول کو دلکش بنارہی تھی۔ میری نظریں پدما کو تلاش کررہی تھیں۔ وہ ایک کونے میں اکیلی بیٹھی کسی سفید مشروب سے تھکن دور کررہی تھی۔ گلاس کے قریب مونگ پھلی کا پیکٹ بھی دھرا تھا۔ مَیں نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ پھر بھیڑ کو چیرتا ''ایکسوزمی ایکسوزمی'' کہتا کاؤنٹر تک پہنچ گیا اور اپنی ڈرنک خرید کر پدما کے سامنے آن بیٹھا۔ اِس سے قبل کہ ہم رسماً ایک دوسرے کا حال احوال پوچھتے، مَیں نے جیب سے تین چابیوں کا مختصر سا گچھا نکال کر اُس کے آگے رکھ دیا۔ گچھا اُس کے لیے ایک معمے کی صورت اختیار کر بیٹھا۔ اُسے دیکھتے ہوئے اُس نے گلاس سے گلاس ٹکرا کر حیرت سے پوچھا: ''یہ کیا ہے؟''

''نئے ٹھکانے کی چابیاں....''

''مطلب؟''

''تم سے کہا تھا نا، اب تمھیں نراش نہیں کروں گا...فلیٹ مل گیا ہے اور وہ بھی بالکل ماڈرن۔''

اُسے میرے کہے پر مشکل سے یقین آتا تھا۔ وہ جانتی تھی مَیں پیدائشی جھوٹا ہوں۔ سچ میرے قریب سے بھی نہیں گزرا۔ لہٰذا سچ جاننا اب اُس کے لیے لازم تھا۔

''فلیٹ دیکھو گی تو دنگ رہ جاؤ گی...وہاں کا ماحول تو کمال کا ہے...بیڈروم سے بہتا ہوا دریائے ٹیمز، اُس پر رواں دواں اسٹیمر، لانچ، کشتیاں....فاصلوں پر لمبے لمبے پُل... پارلیمنٹ ہاؤس، بگ بین اور کچھ فاصلے پر سینٹ پال گرجے کا تاریخی گنبد، سب وہاں سے دِکھتے ہیں۔''

''سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں۔ رات میں کچن سے تو ایسا نظارہ دِکھتا ہے کہ بس پوچھو مت...روشنیوں سے جگمگاتا ہوا شہر۔ جلتے بجھتے آنکھ مچولی کھیلتے نیون سائن، اپنے پاس بلاتے ہوئے... یہ سب دیکھ کر آدمی جھوم اُٹھتا ہے اور شراب پینے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔''

اُس کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ بائیں ہاتھ کی انگلیاں میز پر تھاپ دینے لگیں اور دایاں ہاتھ گچھے کو ہوا میں اُچھالتا رہا۔

''تمھاری شاعری سن کر جی چاہتا ہے کہ تمھارا نیا ٹھکانا آج ہی دیکھا جائے؟''

''مجھے خوشی ہوگی۔''

''اور اگر تمھاری شاعری اور حقیقت میں فرق ہوا تو؟''

''تم جانتی ہو میں نے جھوٹ بولنا چھوڑ دیا ہے۔''

وہ ہنس پڑی اور دیر تک ہنستی رہی۔ لیکن گچھے کو مسلسل اُچھالتی ہوئی میری آنکھوں میں اُترتی رہی۔

''اچھا پدما، اب ایمانداری سے بتاؤ میرا گھر آباد کرنے کب آرہی ہو؟''

''کیا یہ ضروری ہے؟'' اُس نے شرارتاً کہا۔

''بالکل... اسی واسطے تو یہ ٹھکانا حاصل کیا ہے۔''

مجھے سنجیدہ پا کر وہ بھی سنجیدہ ہوگئی تھی۔ پلکیں جھپکائے بنا وہ مجھ کو تکتی رہی، تکتی رہی۔ میں جانتا تھا کہ زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ یقیناً وقت درکار ہوتا ہے۔ گھونٹ بھرتے ہوئے بھی اُس نے سوچ کا دامن نہ چھوڑا۔ بولی:

''اب تم سے کیا چھپانا... میں اپنے ماتا پتا کی بڑی عزت کرتی ہوں۔ مگر وہ پُرانی سوچ کے آدمی ہیں۔ اُن کے ساتھ رہ کر مجھے گھٹن سی ہوتی ہے اور میں خود کو آزاد نہیں پاتی۔''

''تو؟''

''میں تم کو پسند کرتی ہوں۔ تمھارے ساتھ رہا بھی جاسکتا ہے۔ پر میری کچھ شرطیں ہیں۔ اگر تم مان جاؤ تو؟''

سنجیدہ تو میں تھا ہی اب محتاط بھی ہوگیا۔ یہ نکتہ میری سمجھ سے باہر تھا کہ اُس کی شرطیں کیا ہوسکتی ہیں۔ ہم تو پریمی ہیں۔ پریمیوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں۔ بعد میں دیکھیں گے کہ زندگی کیا رُخ اختیار کرتی ہے، اور ہم کن سمتوں میں سفر کرتے ہیں۔ اُس نے کرسی آگے کو کھسکائی اور بولی:

''ہر سنیچر کی صبح ہم گھر اور کچن کا سامان اکٹھے جا کر خریدیں گے۔ جو بھی خرچا ہوگا ہم بانٹ

لیں گے۔''

''منظور ہے۔''

''تم جانتے ہو صبح میں کام پر جاتی ہوں۔ شام کو تھکی ہاری دفتر سے لوٹتی ہوں ...تب تک تم کھانا بنا کر تیار رکھنا۔ ہم ایک آدھ ڈرنک پی کر آرام سے کھانا کھایا کریں گے... برتن میں صاف کردوں گی۔ ہو سکا تو ڈِش واشر لگوالیں گے۔ مگر ویک اینڈ پر ڈنر باہر ہی کیا کریں گے۔''

مَیں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ مَیں کچن میں ایپرن (APRON) باندھے کھانا پکا رہا ہوں۔ بلکہ فرنیچر کی جھاڑ پونچھ بھی کر رہا ہوں۔ لیکن مَیں نے اپنا کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہونے دیا۔ بگلا بھگت بنا خاموش بیٹھا رہا۔ وہ پہلو بدل کر بولی:

''جو بات مَیں کہنے جا رہی ہوں اُسے غور سے سننا...وہ بہت اہم ہے۔ مَیں نہیں چاہتی بعد میں کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔''

''تم بے دھڑک کہو جو کہنا چاہتی ہو۔''

گلا صاف کر کے وہ رواں ہوگئی:

''صرف ویک اینڈ پر ہی تم کو میرے قریب آنے کی اجازت ہوگی۔ وہ بھی رات میں صرف ایک بار.... ہفتے کے دوران کسی بھی روز تم نے اگر مجھ کو چھوا یا زبردستی کی تو مَیں اُسی وقت اپنا سامان اُٹھا کر چل دوں گی۔''

اُس کی یہ کڑی شرط میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ مَیں حیرت زدہ اُسے دیکھتا رہا۔

''تم کو حیران ہونے کی ضرورت نہیں... مجھے اپنا بدن اور اُس کی بناوٹ کو قائم بھی تو رکھنا ہے نا... یہ بھی کہتی چلوں ویک اینڈ پر تم مجھ کو دوبارہ ہرگز نہیں چھوؤ گے۔''

مجھے لگاتار جھٹکے لگ رہے تھے۔ اُس نے اپنا گلاس ختم کیا۔

''یہ کہنا تو مَیں بھول ہی گئی ...ہم کو پوری احتیاط برتنی ہوگی...اگر میرا پاؤں بھاری ہوگیا تو ہماری زندگی کا زاویہ بدل کر رہ جائے گا اور پریشانی الگ سے ہوگی۔''

میرے وہم و گمان بھی نہ تھا کہ اُس کی شرطیں اتنی سخت، اتنی بے جا ہوں گی کہ مَیں چکرا جاؤں۔

مَیں تو اس خیال میں تھا کہ اُس کی آمد پر میرے کئی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اکیلا پن دور ہو گا، دن رات قربت رہے گی۔ پیار بڑھے گا اور جیون میں رچاؤ پیدا ہو گا۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی برعکس ہے۔

''اور بھی کچھ کہنا ہے تمھیں؟''

''ہاں۔ تمھارے ساتھ ایک برس رہ کر دیکھوں گی کہ آیا مَیں بقیہ زندگی تمھارے ساتھ گزار پاؤں گی یا نہیں؟''

مجھے غصہ آ گیا، لیکن مَیں نے خود کو ضبط کے دائرے سے آزاد نہ ہونے دیا۔ مگر یہ کہے بغیر نہ رہ پایا:

''یہ تو سوشیل کنٹریکٹ ہے جو تم مجھ سے کرنا چاہتی ہو۔''

''تو کیا ہوا، اِس میں بُرائی بھی کیا ہے؟... اِس دوران ہم ایک دوسرے کی سوچ، رویے، عادتیں، دلچسپیاں، خوبیاں خامیاں سب جان جائیں گے۔''

بات میری سمجھ میں آ چکی تھی کہ وہ بلینک چیک پر دستخط کرنے سے خوف کھاتی ہے۔ کسی قسم کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتی۔ مجھے اپنا منصوبہ غرق ہوتا دِکھائی دیا۔ حالاں کہ وہ منصوبہ نہ تھا، زندہ رہنے کا ایک صحت مند وسیلہ تھا جسے مل کر ہمیں عملی جامہ پہنانا تھا۔ مزید پریشان ہونے پر یہ خیال میرے ذہن سے گزرا کہ لگے ہاتھوں مَیں بھی چند کڑی شرطیں عائد کر کے اُسے دیوار کے سامنے اُلٹا کھڑا کر دوں۔ تاکہ اُسے میرے وقار، میری مردانگی اور میری اَنا کا بھرپور احساس ہو۔

''میری بھی کچھ شرطیں ہیں۔ اگر تمھیں منظور ہوں تو...؟''

اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ مَیں بھی اُس جیسا کوئی قدم اُٹھاؤں گا۔ مَیں نے دھیرے سے کہا:

''پورے گھر کی صفائی تم کرو گی؟''

اُس کی آنکھیں پھیل کر فریز ہو گئیں۔

''اب تم بھی غور سے سنو... مَیں ہفتے کے دنوں میں روکھا سوکھا ہو کر صبر کر لوں گا... مگر ویک اینڈ پر کوئی پابندی برداشت نہیں کروں گا۔ اِس لیے کہ مَیں اور تم دونوں جوان ہیں اور ہماری کچھ فطری مانگیں بھی ہیں۔''

وہ مصری ممی کی طرح سفید پڑ گئی۔

''تم نے آزمانے کی مدت ایک برس رکھی ہے۔ لیکن مَیں سمجھتا ہوں کسی کو جاننے کے واسطے چھ ماہ بہت ہوا کرتے ہیں.... بولو اب کیا کہتی ہو؟''

وہ میرے سخت رویے سے ذرا بھی خوش نہ تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مَیں نے اُسے مزید بولنے کے قابل ہی نہ چھوڑا تھا۔ وہ پتھرائی ہوئی مورت بنی مجھے دیکھتی رہی۔ مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ جس زمین پر وہ کچھ دیر پہلے کھڑی تھی وہ سرک کر میرے پیروں تلے چلی آئی ہے اور اب بھگوان ہی اُس کا مالک ہے۔

چابیوں کا گچھا ہمارے درمیان جوں کا توں پڑا تھا۔ ہم ایک نظر اُسے بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ کبھی دُزدیدہ اور کبھی براہِ راست، لیکن ہم دونوں جاننا چاہ رہے تھے کہ برف کا تودا توڑنے میں پہل کون کرے گا؟ یہ ایسا سوال تھا جس میں ہماری عزتِ نفس، محبت اور مستقبل سب شامل تھے۔ ہم اپنی اپنی جگہ بہت محتاط تھے کہ کہیں ہماری زندگی کی بساط اُلٹ کر نہ رہ جائے اور ہمارے درمیان فاصلے پیدا ہوں۔ پھر اچانک پتھرائی ہوئی مورت کی اوپری سطح میں حرکت ہوئی۔ دراڑیں پڑتے ہی لب وا ہو گئے اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ پھر اُسی موڈ کو برقرار رکھتے ہوئے ایک سوال داغ ڈالا:

''ہمارے گلاس خالی ہیں۔ ٹھکانا ملنے کی خوشی میں جشن نہیں مناؤ گے؟''

''کیوں نہیں۔ یہ تو شروعات ہے...اب تو جشن ہی جشن ہوا کریں گے۔''

کرسی سے اُچھل کر مَیں نے کاؤنٹر کی طرف قدم اُٹھایا ہی تھا کہ پیچھے سے پدما کی آواز آئی:

''گوند۔ یہ راؤنڈ میری طرف سے ہے۔''

اور دس پونڈ کا نوٹ اُس نے میری طرف بڑھا دیا۔

☆☆

شب کے ساتھی

دن سرد تھے۔ ویک اینڈ کا آغاز تھا اور مَیں مرکزی لندن کی ایک پب (PUB) میں بیٹھا ہفتے بھر کی تھکن ہی دور نہیں کر رہا تھا، بلکہ ''وقت'' کو بھی قتل کرنے کی کوشش میں تھا، جس نے میرے ساتھ کئی انوکھے کھیل کھیلے تھے اور چاہتے ہوئے بھی میرا ساتھ کبھی نہ دیا تھا۔ مجھے زندگی کے ہر موڑ، ہر قدم پر اتنا پریشان کیا تھا جیسے مَیں پورے سنسار میں اس کا واحد دشمن تھا اور ہوں۔ میرے سینے میں اُس کے لیے اِس قدر نفرت بھری ہوئی تھی کہ اگر وہ خود کو کسی پیکر میں سمو کر میرے روبرو آجاتا تو مَیں دُنیا بھر کا بارود اُس پر لٹا کر تالیاں پیٹتا اور بہ آواز بلند کہتا کہ تمھارے نظام میں توازن نہ ہونے کے کارن تمھارا یہ انجام ہوا ہے۔ لیکن ''وقت'' لارڈ کرشنا کی طرح ہر سو پھیلا ہوا مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم، تمھاری آنے والی نسلیں اور تمھارے آبا و اجداد یکجا ہو کر بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم میرے نزدیک ایک بے معنی سا ذرہ ہو، جس کی کوئی وقعت، کوئی اوقات نہیں ہوتی اور وہ تاحیات گردش میں رُلتا رہتا ہے۔ مایوس ہو کر مَیں نے گہرا سانس بھرا اور بیئر کا مگ اُٹھا کر ارد گرد نگاہ دوڑائی۔ ماحول گرم ہو چکا تھا۔ ہر شخص کسی نہ کسی کے ساتھ دکھائی دے رہا تھا۔ کوئی اپنی بیوی کے

ساتھ سر جوڑے بیٹھا تھا تو کوئی اپنی گرل فرینڈ کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے تھا۔ کوئی یار دوستوں کی م .ودگی میں بے فکری سے قہقہے لگا رہا تھا۔ لیکن مَیں واحد شخص تھا جو پب میں تن تنہا تھا، بالکل اُس شخص کی طرح جس کے چاہنے والے تو بے شمار ہوں مگر پھر بھی بھری دُنیا میں وہ تنہا ہو۔ معاً دوست احباب کا دائرہ گلاس کی سطح پر پھیل گیا۔ اُن میں بعض تو ایسے تھے جو میرے بچپن کے سنگی ساتھی تھے اور بعض نے جوانی کی رنگینیاں میرے ساتھ دیکھی تھیں۔ مگر اُن سبھوں نے دیارِ غیر میں آباد ہو کر دولت کو اتنی تیزی سے سمیٹا تھا کہ اُن کی کایا ہی پلٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ اس دوڑ میں دیوانہ وار بھاگ رہے تھے، جب کہ میری ٹانگیں اِس دوڑ کے قابل نہ تھیں۔ مَیں تو ایک ریستوراں میں ادنیٰ سا ویٹر تھا۔ دوستوں کے قریب رہ کر مَیں نے یہی محسوس کیا تھا کہ اُن کی جون ہی بدل چکی ہے۔ وہ وہ نہیں رہے جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ اُن کی ہر ادا سے پیسے کی بو آیا کرتی۔ اُن کی ہر بات، ہر خیال مایا جال میں اُلجھ کر رہ جاتا۔ وہ ضرورت پڑنے پر ہی مجھ سے ملنا پسند کرتے ہیں۔ ورنہ مَیں اُن کے سامنے کھڑے کھڑے دم توڑ دوں اُنھیں ذرا بھی ملال نہ ہوگا۔ مَیں اکثر سوچا کرتا کہ یہ تبدیلی اُن میں کیوں کر در آئی ہے؟ مادہ پرستی اور نو دولتیے بننے کے کارن یا کلاس بدل جانے پر، مغربی اقدار اور طرزِ زندگی اپنانے پر۔ لیکن مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا کرتا۔ ایک روز مَیں نے جلالی کیفیت کے تحت عالمِ تصور میں تمام دوستوں کو موت کے گھاٹ اُتار ڈالا اور خود سے یہ وعدہ کیا کہ اُن کی صورت دور سے دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ وہ سب کے سب خود غرض، مطلب پرست اور موقع شناس ثابت ہوئے تھے۔ لیکن ''وقت'' تو میری گھات میں لگا بیٹھا تھا۔ وہ تنہائی کا چولا پہن کر میرے تن من سے ہوتا ہوا میرے اندرون تک اُتر گیا تھا۔ میری حالت اُس پرندے کی طرح ہوتی چلی گئی جو اپنی ڈار سے بچھڑ کر خلاؤں میں بھٹکتا پھرتا ہو۔ مَیں تو ے (۹۰) لاکھ باسیوں کے شہر میں بالکل اکیلا ہو گیا تھا۔

پب کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ کاؤنٹر تک پہنچنا مشکل ہو رہا تھا۔ لوگ باگ ایک کونے سے دوسرے کونے تک پینے پلانے اور باتوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ لال، پیلے، ہرے لباس بڑھ چڑھ کر اپنی اہمیت کا احساس دلا رہے تھے۔ کچھ 'جوان پنچھی' اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے لمبی اُڑان

کے واسطے پر تول رہے تھے۔ مگر وہ بھی اکیلے نہیں تھے۔ ہر کوئی اپنے شب کے ساتھی کے ساتھ تھا۔ اُنھیں دیکھ کر یہی خیال آتا کہ آدمی اگر یورپ میں ہو، جوان ہو اور اُس کے پاس پنچھی بھی ہو تو یورپ ہر لحاظ سے اس کے واسطے جنت ہے ورنہ یہی جنت اُس کے لیے جہنم ثابت ہوتا ہے۔ حالاں کہ دونوں لفظ ''ج'' سے شروع ہوتے ہیں، لیکن دونوں کے درمیان فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ آدمی کا وجود گرد بن کر رہ جاتا ہے۔ سگریٹ سلگا کر مَیں نے کش لیا ہی تھا کہ لگا کوئی میری دائیں طرف کچھ فاصلے پر بیٹھا مجھے گھور رہا ہے۔ واقعی ایک سفید فام عورت ٹکٹکی باندھے مجھے تک رہی تھی۔ نظریں ٹکراتے ہی اُس کے لبوں کے کونے پھیل گئے اور وہ اپنی عمر سے بڑی دکھائی دینے لگی۔ وہ اٹھائیس تیس کے لگ بھگ تھی۔ بے ترتیب گھنے بال اُس کی گردن اور کانوں کے گرد پھیلے ہوئے تھے۔ دودھیا رنگ کے چہرے پر بڑی بڑی آنکھیں اور ہلکی سی اُٹھی ہوئی ناک، جس نے اُس کی صورت میں کمی پیدا کر دی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے وہ بھی اکیلی نہیں تھی۔ اُس کی نشست کے ایک طرف تین جوان لڑکے یورپین یونین (E.U) کے متعلق بات چیت کر رہے تھے کہ آیا مُلک تُرکی کو اس میں شامل ہونے کی اجازت دی جائے یا نہیں؟ وہ خود میں اتنے کھوئے ہوئے تھے کہ کوئی بھی اُس عورت کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ بھی اُن سے بے نیاز سگریٹ کا دھواں اِدھر اُدھر بکھیر رہی تھی۔ لیکن جانے کیوں میرے اندر کسی نے سرگوشی کی کہ وہ بھی میری طرح اکیلی ہے اور اُسے بھی میری طرح کسی کی تلاش ہے۔ مَیں نے گلاس اُٹھا کے اُسے اشارتاً CHEERS کیا۔ لیکن اُس نے فوراً ہی منہ پھیر کر پب کا داخلی دروازہ دیکھنا شروع کر دیا۔ مجھے سخت شرمندگی ہوئی کہ مَیں نے ناحق کسی اجنبی کو WISH کیا ہے۔ لیکن چند پل بھی نہ بیتے تھے کہ اُس عورت نے اپنا گلاس اُٹھا کر ہوا میں لہرایا اور میری CHEERS کو قبول کر لیا۔ پھر مجھے اپنی جگہ سے اُٹھتا ہوا دیکھ کر وہ ایک طرف کو سرک گئی۔ اُس کے قریب ہی بیٹھے ہوئے عمر رسیدہ آئرش نے جب مجھے اُس عورت کے قریب کھڑے پایا تو وہ بھی اپنی جگہ سے قدرے سرک گیا۔ میز پر گلاس رکھ کر مَیں دونوں کے درمیان پھنس کر بیٹھ گیا اور پیٹھ دیوار سے لگا لی۔ پھر آئرش کا شکریہ ادا کر کے عورت کی طرف زیرِ لب متوجہ ہوا:

''کیا تم اکیلی ہو؟''

''فی الحال تو اکیلی ہوں اور تم؟''

''مَیں بھی اکیلا ہوں۔''

اس مرتبہ اُس کے ہونٹ ہی نہیں دانت بھی پھیل گئے تھے جو بیشتر انگریز عورتوں کی طرح زیادہ اچھے نہ تھے۔ مگر وہ مجھے ذرا بھی بھدے نہ لگے کہ پی پلا کر مَیں اُن ہی سے کچھ چرانے کی کوشش میں رہا کرتا تھا۔ مَیں نے اُسے سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا:

''کیا تم کسی کا انتظار کر رہی تھیں؟''

''مَیں کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتی۔''

اُس کی بے باکی نے مجھ پر گہرا اثر کیا۔ سنجیدگی سے جائزہ لیتے ہوئے وہاں مجھے ایک جزیرہ دکھائی دیا، جہاں ایک انوکھی دُنیا آباد تھی۔ جس کی وہ خود ہی حاکم تھی اور خود ہی محکوم۔

''مگر کبھی نہ کبھی تو انتظار کرنا ہی پڑتا ہے؟''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

مَیں نے پہلو بدل کر دونوں کے درمیان مزید جگہ بنائی اور بولا:

''فرض کرو تم نے کسی سے ملنے کا وعدہ کر رکھا ہو اور تم مقررہ وقت سے پانچ دس منٹ پہلے وہاں پہنچ جاتی ہو۔ ظاہر کہ اُس صورت میں تم انتظار کرو گی؟''

''ایسا موقع کبھی آنے نہیں دیتی۔ مَیں ہمیشہ پانچ دس منٹ دیر سے پہنچتی ہوں۔ ملنے والا وہاں موجود ہو تو ٹھیک، ورنہ سیدھی آگے بڑھ جاتی ہوں۔''

خیال آیا کہ یہ تجربہ، یہ سوچ حاکم کی تھی یا محکوم کی؟ مگر اتنا ضرور واضح ہو گیا تھا کہ حاکم سخت جان ہے اور محکوم بے بس۔ ایک بڑا گھونٹ پی کر مَیں اُس سے مخاطب ہوا:

''مگر تم لوگ تو وقت کے بڑے پابند ہوتے ہو... وقت پر نہ پہنچنا یا دیر سے پہنچنے کو بہت بُرا سمجھتے ہو؟''

''ہاں۔ یہ ہمارا کلچر ہے.... لیکن مَیں ہر چیز کو اپنے ڈھنگ سے دیکھتی ہوں۔''

مَیں نے اپنے ردِعمل سے اُسے جتایا کہ اُس کی بات مجھ تک پہنچنے کی بجائے اُسی تک رہ گئی ہے۔

مگر وہ دانا عورت تھی۔ اُسے میری ذہنی کیفیت کا اندازہ جلد ہی ہو گیا تھا۔ بولی:

''میرے نزدیک انتظار کا مطلب کچھ اور ہے؟''

''بُرا نہ مانو تو وہ بھی بتا دو، کیا ہے؟''

وہ میرے رویے سے مطمئن نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ اس خیال میں تھی کہ جس ذہنی سطح پر وہ بات کر رہی ہے، وہاں تک میری رسائی ہے یا نہیں؟ ہچکچا کر بولی:

''جب کوئی شخص کسی کا انتظار کرتا ہے تو وہ دراصل اپنے پانو کاٹ رہا ہوتا ہے۔''

وہ کہتے کہتے اچانک رُک گئی تھی۔ پھر دور دیکھ کر تلخی سے کہا:

''مَیں نے ایک بار کسی کا انتظار کیا تھا۔ لیکن اتنی بُری طرح سے زخمی ہوئی تھی کہ بیان کرنا مشکل ہے۔''

''بیان کرنے سے فائدہ بھی کیا.... کوئی کسی کے دکھ درد میں شریک تو ہو ہی نہیں سکتا، صرف ہمدردی جتا سکتا ہے۔''

ردِعمل گہرا تھا۔ اُسے یقین سا ہو چلا تھا کہ ادراک کی جس سطح پر وہ سانس لے رہی ہے وہیں کہیں مَیں بھی چہل قدمی کر رہا ہوں۔ وہ بدستور مجھ کو دیکھتی رہی۔ لیکن مَیں نے فضا کو خوش گوار بنانا چاہا:

''ہمارے یہاں کہا جاتا ہے کہ جو مزا انتظار میں ہے وہ دُنیا کی کسی شے میں نہیں۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور یکبارگی اپنی عمر میں بیس برسوں کا اضافہ کر کے پچاس برس کی بن گئی۔ پل بھر کو اُن لڑکوں نے ہمیں دیکھا، پھر خود میں کھو گئے۔ انجام کار وہ ہنسی پر قابو پا کر بولی:

''تم لوگ بڑے رومانی ہو اور جذباتی بھی..... بلکہ کسی حد تک اذیت پسند بھی۔ مَیں ایک بار ایسٹ (EAST) ہو کر آئی ہوں۔ ہماری طرزِ زندگی اور ہماری اقدار تم سے بالکل الگ ہیں جو ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔''

''اسی لیے تم ہر چیز کو اپنے ڈھنگ سے دیکھا کرتی ہو؟''

''تم کہہ سکتے ہو کہ ہاں۔''

ہم خاموش ہلکے ہلکے گھونٹ بھرتے رہے۔ اُس نے جو بھی کہا تھا میرے لیے نیا نہیں تھا۔ مگر اتنا ضرور واضح ہو چکا تھا کہ وہ تیز فہم ہے۔ دُنیا کو الگ نظر سے دیکھتی ہے۔ عام روش سے ہٹ کر دوسروں کو پرکھتی ہے۔

گلاس خالی ہو چکے تھے۔ مَیں نے اُس کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھا کر پوچھا:

''تم کون سی وائن لے رہی ہو۔ ڈرائی یا سویٹ؟''

اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''نہیں۔ مجھے اور نہیں چاہیے۔''

''کیوں ابھی تو رات بھی جوان نہیں ہوئی؟''

اُس نے اپنی نرم نرم اُنگلیاں میرے ہاتھ کی پشت پر پھیریں:

''یہاں CROWD بہت زیادہ ہو گیا ہے....اور مجھے گھٹن ہو رہی ہے۔''

''لیکن مجھے تو CROWD میں رہ کر بڑا آنند ملتا ہے۔ یقین کرو مَیں اُس کا اٹوٹ حصہ بننا چاہتا ہوں۔ ورنہ جب اکیلا ہوتا ہوں تو عجب سا محسوس کرتا ہوں۔''

''مگر اب تو تم اکیلے نہیں ہو؟''

وہ پلکیں جھپکائے بنا مجھ کو تکتی رہی۔ لگا کہ پوری کائنات ایک ہی مرکز پر اکٹھی ہو گئی ہے اور وقت بھی ٹھہر گیا ہے۔ موجودہ لمحے کے بعد اگلا لمحہ شاید ہی جنم لے۔ میرا اُٹھتا بڑھتا بازو انجام کار اُس کی کمر کے گرد پھیل گیا۔ اُس نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی، بلکہ چاہت سے مجھ کو دیکھا۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ زندگی کی پُر پیچ راہوں اور دشوار گزار راستوں میں اُس کے ساتھ دور دور تک قدم اُٹھایا جا سکتا ہے۔ مَیں نے جھک کر اُس کے کان کی گرم لو کو محسوس کیا اور اپنائیت سے کہا:

''آؤ کہیں اور چلتے ہیں۔''

کچھ دیر میں ہم پب کے باہر کھڑے تھے۔ یخ بستہ ہوا نے ہمارا خیر مقدم اِس طرح کیا کہ آن کی آن میں ہمارا انگ انگ آندھی کی زد میں آئے ہوئے خزاں زدہ پتوں کی طرح لرز اُٹھا۔ اگر ہم وہاں کچھ دیر اور کھڑے رہتے تو ہمارے چہرے سُن ہو کر رہ جاتے۔ اُس نے اگلا پل ضائع

کیے بغیر چمڑے کے دستانے نکالے اور بھاری کوٹ کی دوسری جیب سے اونی ٹوپی نکال کر پہن لی۔ سڑک کے اُس پار شیشوں سے بنی ہوئی عمارت میں خوبصورت سا پب تھا جس کی گونا گوں روشنیاں ہر راہگیر کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ اُس نے جھٹ سے میرا بازو تھام کر وہاں چلنے کو قدم بڑھایا۔ جنکشن کی ہری بتی سرخ میں تبدیل ہوتے ہی آتا جاتا ٹریفک رُک گیا اور ہم تیزی سے سڑک پار کر کے پب میں داخل ہو گئے۔ لیکن بدقسمتی سے وہاں بھی وہی حالت تھی جس سے بھاگ کر ہم یہاں تک آئے تھے۔ چوڑس اور جدید پب کا ہر گوشہ جوان طبقے سے بھرا ہوا تھا۔ اُن میں سے بعض تو قالین پر ہی پھیلے ہوئے تھے۔ موسیقی، شور شرابہ، قہقہے، سگریٹ کا گاڑھا کسیلا دھواں، ان سب نے مل کر ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ اُس کے چہرے پر آگ سی لگ گئی تھی۔ لیکن میں نے کندھے اُچک کے بے چارگی ظاہر کی۔ وہ میری ادا سے محظوظ ضرور ہوئی مگر بھیڑ پر بھرپور نظر ڈال کر حقارت سے کہا:

"I AM SICK OF SUCH CROWD, WHICH HAS NO CHARACTER."

وہ کونسل کی عمارت شیفرڈ کورٹ کی پندرھویں منزل پر مقیم تھی۔ لفٹ منزل بہ منزل ہوتی ہوئی آخری منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میرے ایک ہاتھ میں وائن کی نصف بوتل تھی تو دوسرے میں بیئر کے چند ڈبے۔ کیرل نے فش اینڈ چپس کے پیکٹ پکڑ رکھے تھے اور وہ ٹٹولتی ہوئی نظروں سے مجھ کو جاننے کے عمل سے گزر رہی تھی کہ آیا میں اُس کی توقعات پر پورا اُتروں گا یا نہیں؟ جب کہ میں تو اُسے کب کا جان چکا تھا۔ ایک ہی ملاقات میں لاتعداد ملاقاتیں چھپی ہوئی تھیں۔ مختصر سے عرصے میں ہم نے کئی فاصلے طے کر لیے تھے اور کچھ دیر میں ہم آخری فاصلہ طے کر کے ایک دوسرے کی روح تک اُترنے والے تھے۔ اچانک میرے ذہن کے کسی گوشے سے "وقت" نے نمودار ہو کر کہا کہ مجھے جھک کر اُس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ میں اُس کے کرم سے ایک مشاق پنچھی کی صحبت سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ لیکن میری گردن مزید تن کر رہ گئی کہ ذاتی کامیابی میں وقت کا دخل کہاں اور اگر ہے بھی تو وہ اپنے غیر متوازن نظام میں توازن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ باقی سب

بکواس ہے۔

لاؤنج میں داخل ہو کر اُس نے فائر گیس جلایا۔ کھڑکی پر پردے کھینچے اور گلاس لانے کو کچن کی طرف بڑھ گئی۔ سامان رکھ کر مَیں نے فلیٹ پر اُچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ دو کمروں کا فلیٹ تھا۔ سامان ہر طرف بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ فلیٹ کی آرائش، وال پیپر، فرنیچر کی ترتیب اور دیواروں پر آویزاں تصویروں سے نمایاں تھا کہ فلیٹ کی اپنی کوئی شخصیت نہیں ہے۔ کارنس پر دھری ہوئی تصویر کو دیکھ کر میرے حواس گم ہونے لگے۔ کیرل بیاہتا عورت تھی۔ وہ شادی کا لباس پہنے اپنے شوہر کے دوش بدوش کھڑی فخریہ مسکرا رہی تھی۔ غیر مرئی اندیشے سر اُٹھا کر مجھے خود میں گھیرنے لگے اور مَیں دم بخود کبھی تصویر کو دیکھتا اور کبھی صدر دروازے کو۔ عین اُسی وقت کیرل گلاس تھامے گنگناتی ہوئی داخل ہوئی اور مجھے حیران سا پا کر بول اُٹھی:

''ڈرومت مجھے اپنے شوہر سے علیحدہ ہوئے ایک سال سے اوپر ہو چکا ہے۔''

''پھر؟..... پھر تم نے یہ تصویر یہاں کیوں رکھی ہے؟''

''تاکہ ہر کسی کو پتہ چل جائے کہ مَیں ایک بار آگ میں جل چکی ہوں۔''

''تم شادی کو آگ کہتی ہو؟''

''اور کیا کہوں اُسے..... میری شخصیت کو جلا کر رکھ دیا اُس نے۔''

مَیں نے بیئر کے ڈبے کھول کر مشروب گلاسوں میں انڈیلا اور کوٹ اُتار کر اُس کے شوہر پر بھرپور نظر ڈالی۔ وہ دراز قد، چھریرے بدن کا خوبرو جوان تھا۔ اُس کی شوخ آنکھوں میں کئی سوال تھے:

''تمھیں یہ تصویر پریشان نہیں کرتی؟''

''مجھے یہ کیوں پریشان کرنے لگی؟..... میرا اب اس سے رشتہ ہی کیا ہے؟''

''میرا مطلب ہے تمھیں شادی کے وہ حسین دن، راتیں، باتیں، ہنسی مذاق، واقعات اور بُری بھلی یادیں رہ رہ کر یاد نہیں آتیں؟''

''وہ سب ختم ہو چکا ہے۔ میرے لیے ہر شے مر چکی ہے۔''

اُس کا لہجہ تیز تھا۔ گلاس ٹکرا کر اُس نے اپنی بات کو آگے بڑھایا:

''مَیں بہت مشکل سے اُس آگ سے نکل پائی ہوں۔''

مَیں ایک کے بعد دوسرا گھونٹ بھرتا چلا گیا اور مَیں نے جزیرے کے ذریعے اُس کے اندرون تک پہنچنا چاہا۔ لیکن وہاں گہرے پردے حائل تھے۔ لہٰذا مَیں نے براہِ راست دریافت کیا:

''لگتا ہے تم میرج کے بعد ذاتی آزادی کھو بیٹھی تھیں؟''

''تم آزادی کی بات کرتے ہو، میری تو شخصیت ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔''

اُس نے بے حد اُکھڑ کر کہا۔ پھر کچھ دیر بعد نہایت افسوس کے ساتھ گویا ہوئی:

''کسی کو اتنا پیار بھی نہیں کرنا چاہیے کہ عورت کی اپنی شخصیت دب کر رہ جائے اور مرد اُس پر اتنا حاوی ہو جائے کہ وہ ہر قدم پر فائدہ اُٹھانے لگے.... یقین کرو مَیں وہ نہیں رہی تھی جو شادی سے پہلے تھی۔''

مَیں سمجھ گیا کہ کیرل بھی ہر یورپین عورت کی طرح خودمختار اور آزاد ہے۔ وہ بھی شہری حقوق، شخصی آزادی اور زندگی کے ہر شعبے میں مساوات چاہتی ہے۔ وہ مرد کی برتری اور اُس کا غلبہ کسی بھی طور برداشت نہیں کر پاتی، خواہ وہ معاشرتی زندگی میں ہو یا ازدواجی زندگی میں۔ اُس نے گلاس میز پر رکھ کر پوچھا:

''تم تو اس آگ میں جل چکے ہو نا؟''

''نہیں ابھی تک تو بچا ہوا ہوں۔''

''کتنے خوش قسمت ہو تم۔ مَیں تو کہوں گی، بھول کر بھی آگ کے قریب مت جانا۔ ورنہ راکھ ہو جاؤ گے۔''

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی لیکن مَیں نے گفتگو کا ربط ٹوٹنے نہ دیا:

''مگر جانے کیوں لوگ کہتے ہیں کہ بیاہ شادی کے بعد ہی آدمی مکمل ہوتا ہے۔''

''ممکن ہے مرد مکمل ہو جاتا ہو، پر عورت ادھوری ہی رہ جاتی ہے۔ اس لیے کہ مرد اُس پر حاوی ہو جاتا ہے۔''

اُس کی باتوں سے زیادہ اُس کی شراب مجھ پر اثر چھوڑ رہی تھی۔ لیکن مَیں نے مناسب یہی سمجھا کہ

موضوع کو زندہ رکھ کر اُس سے وہ پہلو دریافت کیا جائے جو میرے نزدیک نہایت اہم تھا۔
''شوہر سے علیحدہ ہو کر تم خود میں کمی محسوس نہیں کرتیں؟''
''تم ذہین ہو، ہو سکے تو کھل کر بات کرو۔''
''میرا مطلب ہے تم ایسا محسوس نہیں کرتیں کہ تم اتنی بڑی دُنیا میں پھر سے اکیلی ہو گئی ہو؟''
''اکیلی تو میں پہلے بھی تھی.... پھر کیوں بھولتے ہو کہ آدمی اکیلا ہی پیدا ہوتا ہے۔ اکیلا ہی زندگی سے لڑتا ہے اور اکیلا ہی مر جاتا ہے۔''
''مگر زندگی کے سفر میں آدمی کہاں تک اکیلا چل سکتا ہے؟ کبھی نہ کبھی تو اُسے ہم سفر کی ضرورت پڑتی ہی ہے۔ ورنہ اکیلا پن اُسے قدم قدم پر ڈسنے لگتا ہے۔''
''صرف اُن لوگوں کو جو اکیلے پن سے ڈرتے ہیں۔ مجھے تو اکیلے پن سے محبت ہے۔ میں اکیلا رہنا پسند کرتی ہوں۔''
مجھے اُس کے رویے پر تعجب ہوتے ہوئے بھی تعجب نہیں ہو رہا تھا کہ عموماً انگریز عورت ماضی میں کم، حال میں زیادہ زندہ رہتی ہے۔ وہ زندگی کو جس طرح سے وہ ہے، قبول کرتی ہے۔ لیکن اُس کے خیالات کی گہرائی اور سوچ کے تسلسل سے واضح تھا کہ اُس کی ہر بات، تجربہ اور مشاہدہ اُس کی اپنی ذات کے تعلق سے ہے۔ لیکن میں پھر بھی بال کی کھال نکالنے سے باز نہیں آرہا تھا:
''مانا کہ تمھارا تعلق خود سے بہت گہرا ہے اور تم دن کا ہر پل اپنے ساتھ گزارنا چاہتی ہو.... مگر کبھی نہ کبھی تو تمھیں خود سے اُکتاہٹ ہوتی ہو گی؟''
''میں تمھارا مطلب سمجھ گئی۔ یقین کرو میں کئی کئی ہفتوں تک اپنے دوستوں سے بھی نہیں ملتی۔ پھر ملوں بھی کس لیے؟ شخصیت کے ٹکراؤ کے لیے؟ انا کو ٹھیس پہنچانے کے لیے؟.... خود میں نا آسودگی پیدا کرنے کے لیے؟''
اُس کے لہجے میں زمانے بھر کا طنز چھپا ہوا تھا۔ لگا کہ وہ سارا زہر، جو اُس کے سینے میں بھرا ہوا ہے، اُگل ڈالے گی۔ مجھے خیال آیا کہ میں اور وہ اُن کشتیوں کے مسافر ہیں جن کی منزل تو ایک ہے لیکن وہ دھند میں کھوئی ہوئی الگ الگ دھاروں پر بہہ رہی ہیں۔ کیرل اکیلے ہوتے ہوئے بھی

اکیلی نہیں ہے۔ جب کہ میں نہ ہوتے ہوئے بھی اکیلا ہوں۔

''شاید تم سوچ میں ہو کہ میں نٹ کیس (NUT CASE) ہوں؟''

''نہیں میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے سوچنے کا ڈھنگ کتنا الگ الگ ہے۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں، ہم اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں؟''

''یہ کہنا تو کافی مشکل ہے۔ لیکن تمھاری پرابلم کچھ اور ہے جس نے تمھیں تنگ کر رکھا ہے۔''

یوں لگا کہ اُس نے میرے اندر جھانک کر جان لیا ہو کہ میں زندگی کے دوراہے پر بے یار و مددگار کھڑا ہر راہ گیر کے ساتھ قدم اُٹھانے کو تیار ہوں۔ یکبارگی میرے بدن سے کپڑے غائب ہو گئے اور میں اُس کے سامنے برہنہ بیٹھا رحم کی بھیک طلب کر رہا ہوں۔ ایک مرتبہ پھر مجھے گلاس کی ضرورت محسوس ہوئی اور میں ایک ہی گھونٹ میں تین چوتھائی گلاس خالی کر گیا۔ کیرل کا چہرہ ہمدردی سے بھر گیا۔ لیکن لبوں پر پھیلی پیچیدہ مسکراہٹ پھانس بن کر میرے اندر اُتر گئی۔ فاصلے ہمارے درمیان از سرِ نو پیدا ہو گئے اور ہم پھر سے اجنبی بن گئے۔ کیرل کو احساس ہوا تو برجستہ بول اُٹھی:

''اس دُنیا میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس کے ہاں پرابلم نہ ہو۔ میرے ہاں بھی وقت بے وقت ایک پرابلم پیدا ہوتی ہے۔ وہ مجھے سخت پریشان کرتی ہے.... مگر دُنیا میں ہر پرابلم کا حل موجود ہے نا؟''

اُس کی پرابلم کو سمجھنے کی خاطر مجھے زیادہ مغز پچی نہ کرنی پڑی تھی۔ وہ اُس خشک ندی کی طرح تھی جو اپنی خشکی سے تنگ آ کر ہر سمت سے رواں پانی کو خود میں سمو کر اپنی پیاس بجھانا چاہتی ہے اور یوں وہ خود کو سیراب کر لیتی ہے۔ میں اُسے ذہن نشین کرانا چاہتا تھا کہ آدمی کتنا ہی تنہائی پسند کیوں نہ ہو، اُس نے کتنی بھی دیواریں اپنے اِردگرد کیوں نہ کھڑی کر رکھی ہوں۔ اُسے دوسروں کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ لیکن اُس نے مجھے لب کشائی کا موقع ہی نہیں دیا۔ صوفے سے اُٹھ کر اُس نے کمرے کی بڑی بتی بجھا دی۔ صرف سپاٹ لائٹ جلتی رہ گئی۔ کمرے کی شخصیت بدلتے ہی مدھم روشنی میں ہر شئے کا رنگ روپ بدل گیا۔ لیکن ماحول نکھرتے ہی جذبات اُبھرنے لگے۔ اُس نے ہائی فائی یونٹ کا بٹن دبایا تو الگ الگ جگہ پر دھرے ہوئے اسپیکروں سے موسیقی کی آواز اُبھرنے لگی۔

گانے کے بول فضا میں جادو جگانے لگے۔

"ALL YOU NEED IS LOVE --- LOVE --- LOVE"

موسیقی کی تھرتھراہٹ پر اُس کے شریر کا انگ انگ جھوم اُٹھا۔ پھر وہ ہولے ہولے جھومتی ہوئی اادائے خاص سے تن سے ایک کے بعد دوسرا کپڑا الگ کر کے اُسے ہوا میں لہراتی چلی گئی۔ ہلکی روشنی میں بھی اُس کا گورا بے داغ بدن مقناطیس بنا مجھے اپنی طرف کھینچتا رہا۔ وہ مستی میں ڈوبی، آنکھیں موندے بدن کے انگ انگ پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ مَیں تیزی سے اُٹھا اور قمیص کے بٹن کھولتا ہوا اُسے اپنی بانہوں میں بھرلیا۔ پھر ہمارے ہونٹ، ہاتھ اور بدن پیار کی زبان میں بات کرنے لگے۔ ہم ایک دوسرے کے واسطے لاکھ اجنبی سہی، ہمارے سوچنے کا ڈھنگ بھی الگ الگ سہی، مگر پیار کرنے کا ڈھنگ ایک جیسا تھا۔ مجھے ذرا بھی احساس نہ ہوا کہ وہ دُنیا کے کسی الگ خطے، الگ نسل اور الگ قوم سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ دیوانہ وار میرے چہرے پر ہونٹوں کے نشان چھوڑ رہی تھی۔ جب کہ میرے ہاتھ اُس کے بدن کی پیمائش میں مصروف تھے۔ پھر مَیں نے ایک ہی جھٹکے سے اُسے بازوؤں میں اُٹھالیا اور اُس کے ہونٹ اپنے ہونٹوں میں مقید کر کے اُس کی خواب گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ کھڑکی پر پھیلے ہوئے پردے کے پیچھے دن کا اُجالا اپنی عظمت کا اعلان کر رہا تھا۔ پردے کی رنگت بھی اُس کی شدت سے بدلی بدلی سی تھی۔ کیرل ابھی تک بے خبر سو رہی تھی۔ اُس نے مجھے اپنی بانہوں میں اتنی مضبوطی سے جکڑ رکھا تھا کہ جیسے اُسے ڈر ہو کہ مَیں کچھ ہی دیر میں اُس سے جدا ہونے والا ہوں اور کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ لیکن اُس کے چہرے پر ڈھیروں سکون تھا، طمانیت تھی، قرار تھا۔ مَیں بھی خود کو ہلکا محسوس کر رہا تھا اور میری آتما بھی خوش تھی۔ مَیں نے خود کو کیرل سے الگ کر کے اُٹھنا چاہا تو اُس کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔ پھر اُس نے میری پیٹھ پر ناخن کھروچنے شروع کر دیے۔ میرے بدن میں جھرجھری ہوئی تو چیونٹیوں نے منہ کھول ڈالا اور سوئیاں سینے میں چبھنے لگیں۔ بس پھر کیا تھا۔ ہم، ہمارے بدن اور

ہمارے دماغ بھرے اُجالے میں ایک دوسرے کو مزید جاننے میں جٹ گئے۔

چائے کا پیالہ ختم کر کے جب مَیں اُس کے فلیٹ سے چلنے کو تیار تھا تو کیرل شب خوابی کا گاؤن پہنے میرے قریب چلی آئی۔ گہری نظروں سے دیکھا جیسے میں اُس کے نزدیک نہایت ہی اہم شخص ہوں اور ہمارے درمیان رات اور دن میں جو بھی ہوا وہ بھی اپنی جگہ نہایت اہم تھا۔ اُس نے دھیمے سے کہا:

''کل رات تم نے کہا تھا، ہم اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں؟''

''ہاں، کہا تو تھا؟''

''مَیں بھی اب ویسا ہی محسوس کر رہی ہوں۔''

میری آنکھوں کی روشنی تیز ہوگئی اور مَیں نے اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ اکیلا پن دور ہوتا دکھائی دیا۔ سارا جگت مسکرا اُٹھا اور مَیں نے خود کو ہمالیہ کی چوٹی پر کھڑا پایا۔

''لیکن میری ایک شرط ہے؟''

''کیا؟''

''مَیں تم سے تب ہی ملنا پسند کروں گی جب مَیں چاہوں گی؟''

''ورنہ؟''

''ورنہ نہیں۔''

اُس نے قطعیت کے ساتھ کہا۔ مَیں چکرا گیا۔ میرے ہاتھ خود بخود اُس کے ہاتھوں سے الگ ہوگئے۔ لیکن کئی سوال میرے وجود پر پھیل گئے۔ اُن میں طنز بھی تھا اور سمجھ بوجھ کا عنصر بھی۔ فوراً صوفے سے کوٹ اُٹھایا اور بولا:

''کیرل۔ تمھاری ٹریجڈی بڑی عجیب ہے جس نے تم کو سخت تنگ کر رکھا ہے۔''

وہ محتاط ہوگئی۔

تمھیں مرد ذات سے سخت نفرت ہے۔ تمھارے بس میں ہو تو تم اُس سے بات بھی نہ کرو؟''

وہ محتاط تو تھی ہی، سنجیدہ بھی ہوگئی۔

''لیکن تم کو مرد ذات کی ضرورت بھی وقت بے وقت رہتی ہے۔ اُس کے بغیر تم رہ نہیں سکتیں۔''
میرا انکشاف اُس کے واسطے کڑوی گولی ثابت ہوا۔ چہرے پر ہر آتے جاتے رنگ سے عیاں تھا کہ مَیں نے اُس کی شخصیت پارہ پارہ کر ڈالی ہے۔
''مَیں اکیلا ضرور ہوں، لیکن اخلاق سے اتنا گرا ہوا نہیں کہ تم مجھ کو ایک سٹڈ (STUD) کی طرح استعمال کرتی رہو۔''
کیرل پتھرا کر رہ گئی۔

☆☆
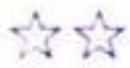
المیہ

سانجھ ڈھل چکی تھی۔ چوپاٹی کا پورا علاقہ روشنیوں سے جگمگا اُٹھا تھا۔ ہر سو رونق تھی۔ مسالے دار چاٹ، بھیل پوری، ناریل پانی، آئس کریم قلفی اور چھولے بھٹوروں کا کاروبار زوروں پر تھا۔ ساگر کی لہریں اور اُن کا شور بھیڑ کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ مَیں جس عمارت کی تیسری منزل پر رہائش پذیر تھا، وہ چوپاٹی کے عین سامنے موڑ پر واقع تھی۔ لیکن مَیں وہاں کے ماحول اور حسین منظر میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا کہ مجھے ایک اخبار کے لیے مضمون سپردِ قلم کرنا تھا۔ مَیں کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہل کر مضمون کے نکات پر غور کر رہا تھا اور پل بہ پل گہرے پانیوں میں اُتر رہا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے شاہ جی کھڑے مسکرا رہے تھے۔

اُن کے ایک ہاتھ میں وہسکی کی بوتل تھی اور دوسرے ہاتھ میں کاروباری چرمی بیگ۔ وہ گنگناتے ہوئے داخل ہوئے اور بوتل کی طرف اشارہ کر کے کہا:

''آؤ دو دو ہاتھ ہو جائیں۔''

مَیں انکار نہ کر سکا۔ پینا پلانا میری کمزوری تھی۔ فوراً گلاس میز پر سجا دیے اور بوتل پر ایک نظر ڈال کر اُس کے خالق کی دل ہی دل میں تعریف کی کہ اُس نے شے ہی ایسی تخلیق کی تھی، جسے پی کر ہزار پردوں میں چھپا ہوا آدمی بھی برہنہ ہو جاتا ہے۔ شاہ جی نے بوتل میز پر رکھ دی اور خود کو کرسی کے حوالے کر کے، بیگ میں سے گولڈ فیلک کا پیکٹ نکالا اور سگریٹ کو اپنے مخصوص انداز میں سلگا کر فضا میں مرغولے چھوڑنے لگے۔ اُنھیں فضا میں پھیلتے ہوئے دیکھ کر مجھے چند سال پہلے کا وہ منظر یاد آ گیا جب ایک دوست نے مجھے اُن سے متعارف کرایا تھا۔ اُس سے بھی وہ کش پہ کش لیے مرغولے چھوڑ رہے تھے۔ مجھے سخت اچنبھا ہوا کہ پچاس باون برس کا ادھیڑ عمر شخص بھی جوانوں جیسے شوق رکھتا ہے۔ لیکن انھوں نے میری حیرت زدہ نظروں سے بھانپ لیا تھا کہ مَیں کس سوچ میں گم ہوں۔ سنجیدہ ہو کر بولے:

"منش شریر سے بوڑھا ہوتا ہے، من سے نہیں .... یہ جو دائرے ہیں نا، یہ جیون کے دائرے ہیں۔ مَیں ان کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔"

مَیں اُن کی ذہانت سے متاثر ہوا تھا۔ مزید اُن کی زندگی کا تجربہ اور مشاہدہ بھی بول رہا تھا۔ بارہا ملنے پر قربت بڑھی تو عمروں کا فرق مٹ گیا اور ہم بے تکلف دوست بن گئے۔ اُن کا پیدائشی نام تو کچھ اور تھا، لیکن وہ پوری دُنیا میں شاہ جی کے لقب سے مشہور تھے۔ حتیٰ کہ اُن کی ماں بھی اُنھیں اسی نام سے مخاطب کیا کرتی تھی۔ ایک روز مَیں نے اُن کا اصلی نام جاننے کی بڑی ضد کی۔ پہلے تو وہ خوب ٹپٹائے، مگر جب دیکھا کہ مَیں پنجے جھاڑ کر اُن کے پیچھے پڑ گیا ہوں تو اپنائیت سے مسکرا کر بولے:

"یار کیوں تنگ کرتے ہو۔ اب تو مَیں بھی اپنا نام بھول گیا ہوں۔"

اُنھوں نے طبیعت ہی کچھ ایسی پائی تھی کہ کوئی بھی دوسرا نام اُن پر صادق نہیں آتا تھا۔ اُن کی جیبیں ہمہ وقت یار دوستوں کے واسطے کھلی رہتی تھیں۔ روپیا پیسا اتنی بے دردی سے خرچ کرتے کہ بائیں ہاتھ کو احساس تک نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کتنا خرچ کیا ہے۔ مَیں نے کئی بار اُنھیں ٹوکا بھی تھا کہ وہ اپنی ٹھیکیداری کی ساری کمائی شراب، شباب اور شوق کی نذر کر ڈالتے ہیں۔ مگر اس طرح کی باتیں

سن کر وہ اکثر سنجیدہ ہو جاتے اور اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا کرتے :

''اسی کا نام جیون ہے گُل بھوشن ..... کھاؤ، پیئو اور جیؤ۔ ورنہ جیون زہر سے کم نہیں ..... بڑھاپے میں پہنچ کر پچھتاؤ گے، جوانی میں عیش کیوں نہیں کیا؟''

اُن کی گہری باتیں مجھے سوچنے پر مجبور کیا کرتی تھیں اور میں اُن کی زندہ دلی کا گرویدہ تو تھا ہی۔ مگر وہ حددرجہ جذباتی بھی واقع ہوئے تھے۔ کسی یار دوست کو مصیبت میں دیکھ کر خود بھی پریشان ہو جایا کرتے۔ موجودہ کمرہ بھی مجھ کو اُن ہی کی رسائی اور وسیع تعلقات کی بنا پر حاصل ہوا تھا۔ ورنہ پگڑی دینے کے لیے مجھ جیسے پھکڑ صحافی کے پاس تو پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ انھوں نے مالک مکان کے کان میں جانے کیا پھونک ماری کہ اگلے روز کمرے کی چابی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے جاننا چاہا کہ یہ چمتکار فٹافٹ کیسے ہو گیا؟ بولے :

''کچھ باتیں پوچھنے کی نہیں سمجھنے کی ہوتی ہیں۔ اِس بلڈنگ کا مالک کبھی میرا لنگوٹیا رہا تھا۔ ہماری کمزوریاں ساجھی تھیں۔ انکار کیسے کرتا؟ ..... بس تم کرایا برابر دیتے رہنا۔''

چوپاٹی جیسے شان دار علاقے میں کمرہ پاکر میں اُن سے لپٹ گیا تھا ورنہ میں برسوں تک ناگپاڑہ کی غلاظت میں ہی سانس بھر رہا تھا۔

شراب کا دور شروع ہو گیا۔ دو پیگ تک ہم دیش کے سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی حالات پر روشنی ڈالتے رہے۔ وہ دیش کے تمام ریا کار افسروں کے ساتھ سیاسی رہنماؤں کو بھی ننگی ننگی گالیاں دے رہے تھے کہ اُن لوگوں نے دیش کی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ پولیس سے لے کر عدلیہ تک کوئی بھی کام رشوت کے بغیر انجام نہیں پاتا۔ لیکن جب تیسرا پیگ شاہ جی پر اپنا اثر کر بیٹھا تو انھوں نے موضوع بدل ڈالا۔ عورت ذات اُن کا دل پسند موضوع تھا۔ اُس پر ایک اتھارٹی کی حیثیت سے بات شروع کر دی۔ بڑھ چڑھ کر اُس کی شان میں قصیدے پڑھنے لگے۔ پھر میرے شانے پر ہاتھ مار کر رازدارانہ لہجے میں کہا:

''عورت اس سنسار کی سب سے بڑی سچائی ہے۔ باقی سب بکواس ہے۔''

مگر مَیں نے اُن کے خیال کی تردید کی:

''شاہ جی اگر ہم عورت میں سے جنس نکال دیں تو عورت اور پتھر میں کیا فرق رہے گا؟''

انھوں نے اگلے پل نظر کا چشمہ ناک پر ٹھیک سے جمایا اور دوٹوک لہجہ اختیار کیا:

''تم سالے لکھاری ہمیشہ اُلٹی بات کرتے ہو..... اگر ناری ذات نہ ہو تو یہ سنسار ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔''

''آپ کا کہنا سر آنکھوں پر.... مگر مَیں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر عورت میں سے جنس اور اس کی کشش نکال دیں تو اُس میں اور ایک پتھر میں کیا فرق رہے گا؟''

''تم کیا جانو عورت کیا ہے؟ بھگوان نے جس قدر پیار محبت، ممتا، رکھ رکھاؤ، لجّا، وفا، صفائی ستھرائی اور بلیدان کا جذبہ اُسے دیا ہے۔ مرد میں کہاں ہے؟ .... وہ سالا تو خود غرض، کمینہ، حاسد، مطلبی، جھوٹا اور جانے کیا کیا ہے۔''

غرض یہ کہ وہ عقلیت اور منطق کا سہارا لے کر مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن مَیں اپنے موقف سے ٹس سے مَس نہ ہوا اور نتیجہ صفر نکلا۔

بوتل کے تین چوتھائی ختم ہونے پر شاہ جی کی آنکھوں میں سُرخ ڈورے پھیل چکے تھے۔ ہونٹوں سے رال ٹپک رہی تھی۔ واضح تھا کہ اُن کا انگ انگ عورت کی قربت کے لیے تڑپ رہا ہے۔ اُنھوں نے گردن گھما کر دیوار پر آویزاں کیلنڈر کو دیکھا۔ وہاں بھگوان شیو گلے میں ناگ ڈالے اور ہاتھوں میں ترشول لیے کھڑے تھے۔ اُن کے کندھے پر پاروتی نے اپنا سر ٹکا رکھا تھا۔ اُن کے پریم بھرے نین کہہ رہے تھے کہ جب ناری اور پُرش ایک ہو کر مُتھن بنتے ہیں تو اُن کو جیون کا آنند ملتا ہے۔ ہماری نظریں ٹکرائیں تو شاہ جی نے اشارتاً کہا:

''چلتے ہو؟''

مَیں قدرے جھینپ گیا اور شرمایا بھی کہ مَیں نے اس قسم کے پروگرام میں کبھی اُن کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ دوسری بات مجھے گھناؤنے کوٹھوں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ پہلی بار وہاں گیا تھا تو سیڑھیاں اُترتے وقت یہ احساس میرے ساتھ تھا کہ مَیں کسی مجبور عورت کا جسم خریدنے کی بجائے اپنی

جوانی میں داغ لگا کر آیا ہوں۔ پھر ڈاکٹر نے پانچ چھ انجکشن بھی لگا دیے تھے اور مَیں نے سدا کے لیے توبہ کر لی تھی۔ مگر پی پلا کر خواہش اکثر جاگ اُٹھا کرتی تھی۔ اس بار بھی آگ سینے میں دہک اُٹھی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ شاہ جی کی دعوت کو جھک کر قبول کر لوں۔ لیکن مَیں نے عذر پیش کیا کہ مجھے ایک روزنامے کے لیے مضمون لکھنا ہے، ورنہ دال روٹی سے بھی جاؤں گا اور کھانے کے واندے پڑ جائیں گے۔ مگر اُنھوں نے میرے سبھی جواز مسترد کر دیے:

''یار میری طرف دیکھو.....شادی شدہ ہوں..... پر ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا.....چلو اُٹھو۔''

انھوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر زبردستی اُٹھانا چاہا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اس مرتبہ شیر سے بچنا ناممکن سا ہے تو مَیں نے شیر کی آڑ میں شکار کھیلنا مناسب سمجھا۔

ٹیکسی مرین ڈرائیو سے ہو کر چرچ گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ٹیکسی امیر ترین اور صاف ستھرے علاقے سے کیوں کر گزر رہی ہے؟ جب کہ ہمیں تو شہر کے غلیظ ترین اور بدنام علاقے میں جانا تھا۔ شاہ جی نشست پر سر ٹکائے، آنکھیں موندے گنگنا رہے تھے۔ مَیں کھڑکی سے باہر ساگر کی اُچھلتی دودھیا لہروں کو سڑک کے لیمپ پوسٹوں کی زرد روشنی میں دیکھ رہا تھا، جو میرے احساسِ جمال کو تسکین بخش رہی تھیں۔ اچانک شاہ جی نے گنگنانا بند کر دیا اور بولے:

''کوڑی نہ رکھ کفن کے لیے۔''

مَیں نے چونک کر اُن کی طرف دیکھا تو انھوں نے پھر سے گنگنانا شروع کر دیا۔ ٹیکسی ریگل سنیما کے قریب پہنچی تو شاہ جی نے ڈرائیور کو ایک کشادہ عمارت کے سامنے رُکنے کو کہا۔ پیسے چکا کر وہ مست ہاتھی کی طرح جھومتے ہوئے اُس عمارت میں داخل ہو گئے۔ دوسرے مالے پر پہنچ کر وہ ایک فلیٹ کے سامنے رُک گئے اور دروازے کے قریب لگی ہوئی گھنٹی کو دبا دیا۔ میرا دل اُوپر نیچے ہوا جا رہا تھا۔ میری حالت دیکھ کر وہ مسکرا دیے اور بائیں آنکھ دبا کر کہا:

راجا گھبراؤ مت۔ یہاں دھندا پرائیوٹ طریقے سے چلتا ہے۔''

دروازہ کھلا تو ایک سن رسیدہ عورت ہمارے خیر مقدم کو وہاں کھڑی تھی، لیکن اُس کا دانتوں بغیر منہ

دیکھ کر سخت کراہیت ہوئی۔ غالباً وہ دانتوں کا ڈینچر (DENTURE) لگانا بھول گئی تھی۔ اُس نے شاہ جی سے شکایتاً کہا:

"کدھر تھا تم؟ بہت دن بعد آیا؟"

شاہ جی نے پلٹ کر کہا:

"نوٹ چھاپ رہا تھا.... اب پھونکنے آیا ہوں۔"

وہ کمرے کے وسط میں پہنچ کر ایک صوفے پر یوں پھیل گئے گویا وہ اُن کا اپنا ہی گھر ہو۔ اتنے میں پانچ چھ لڑکیاں دوسرے کمرے سے وارد ہوئیں اور ہمارے سامنے اس انداز میں کھڑی ہوگئیں جیسے کوئی دکاندار چھ سات قسم کے الگ الگ نمونے گاہک کے سامنے پھیلا کر اُسے مال پسند کرنے کو کہتا ہے۔ میری نظریں بھی مال کو انتخاب کرنے میں کھوگئیں۔ ہر لڑکی کا لباس جاذبِ نظر تھا اور اُس نے بناؤ سنگار بھی خوب کر رکھا تھا۔ وہ سبھی مختلف اداؤں سے ہم دونوں کو اپنی طرف کھینچنے میں کوشاں تھیں۔ ایک لڑکی آنکھوں سے باتیں کرتی ہوئی اور اپنے اُبھاروں کو مزید اُبھارتی ہوئی میری طرف بڑھی، لیکن میں نے گردن گھما کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ذرا بھی مایوس نہ ہوئی بلکہ شاہ جی کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی اور اپنے بازو اُن کی گردن میں ڈال کر جتانے لگی کہ وہ یگوں سے اُن کے انتظار میں تھی۔ میں نے دیکھا، ایک کونے میں ایک لڑکی سب سے الگ تھلگ بیٹھی، گردن جھکائے فرش کو دیکھ رہی تھی۔ عمر اکیس بائیس برس، کالے رنگ کی ساڑھی اُس نے اپنے متناسب جسم کے گرد باندھ رکھی تھی اور اُسی رنگ کا بلاؤز بھی پہن رکھا تھا۔ وہ بھی اتنا کسا ہوا تھا کہ اُس کا بولتا بدن شاہ جی کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا، لیکن میں اُن کی راہ میں حائل تھا۔ وہ لڑکی اُٹھ کر ایک کمرے کی طرف بڑھی تو میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ کمرہ دس بائی بارہ فٹ کا تھا۔ سب سے پہلے میری نظر بستر پر پڑی جو مجھے دُنیا کا مشترکہ بستر محسوس ہوا۔ اُس پر کئی بدن چومتے چاٹتے دکھائی دیے۔ میں آرام دہ کُرسی پر بیٹھ گیا اور دیوار پر لٹکتے ہوئے آئینے میں لڑکی کا عکس دیکھنے لگا۔ وہ دروازہ بند کر کے بستر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں جہاں بھر کی اُداسی رچی تھی۔ ایسی اُداس آنکھیں میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ بستر پر بیٹھ کر اُس لڑکی کے

ہاتھ میکانکی انداز میں بلاؤز کے بٹن کھولنے لگے، لیکن میں نے اُسے روک دیا۔

''اتنی جلدی بھی کیا ہے..... پہلے کچھ.....؟''

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اُس کی آنکھوں کی اُداسی غائب ہوگئی، جس کی جگہ بھرپور نفرت نے لے لی تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے چہرے پر اُمڈ آئی تھی۔

''میرا مطلب ہے.....کچھ بات چیت.....یعنی کچھ تم پوچھو.....کچھ مجھے پوچھنے کا موقع دو۔''

''مَیں جانتی ہوں تم کیا پوچھوگے.....یہی نا کہ تمھارا نام کیا ہے؟... کہاں کی رہنے والی ہو؟..... یہاں کیسے پہنچ گئیں؟.....تم نے یہ پیشہ کیوں اختیار کیا؟...اس سے پہلے کیا کرتی تھیں؟...تم یہ دھندا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں؟''

اُس نے ایک ہی سانس میں سبھی سوال، اپنے طرار لہجے میں کہہ ڈالے تھے، جن کو سنتے سنتے اُس کے کان پک چکے تھے۔ حالات نے اُس کے باطن میں کتنا زہر بھر دیا تھا جو اُس کے لبوں سے چھلک کر دھرتی پر پھیل رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ زہر دھرتی کی کوکھ سے ہی پھوٹ کر انسان کے جسم میں پھیلا کرتا ہے، جسے صرف ''وقت'' ہی ختم کرسکتا ہے، ورنہ وہ آدمی کو ختم کرڈالتا ہے۔ مَیں تو محض اُس سے یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اتنی اُداس کیوں ہے؟ اور اُس نے ماتمی لباس کیوں پہن رکھا ہے؟ لیکن پھر خیال آیا کہ مجھے اُس سے پوچھنے کا حق ہی کیا ہے؟ وہ میرے ہر سوال کا جواب گالی سے بھی دے سکتی ہے اور میری عزت کا چولا ہوا میں اُڑا سکتی ہے۔ بہتر یہی ہوگا کہ جس مقصد کی خاطر مَیں یہاں آیا ہوں اُسے پورا کرکے چلتا بنوں۔ مگر اُس کی اُداس آنکھیں، لہجے کی نفرت اور ماتمی لباس مجبور کررہا تھا کہ مَیں کچھ نہ کچھ ضرور دریافت کروں:

''وہ سوال لوگوں نے تم سے پوچھے ہیں۔ مَیں نے نہیں؟.....مَیں اُن سب سے الگ ہوں.....اس لیے کہ آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے۔''

اُس نے ترچھی نظروں سے مجھے دیکھ کر جتانا چاہا کہ مَیں برملا جھوٹ بول رہا ہوں اور دُنیا کا سب سے بڑا مکار ہوں۔ پھر اُس نے میرے خاموش اور معصوم چہرے میں جانے کیا دیکھا کہ اُس نے اتنے زور سے قہقہہ لگایا کہ میرے ساتھ کمرے کی دیواریں بھی ہل گئیں۔ مَیں نے جھینپ کر ادھر

اُدھر دیکھا کہ ہمارے علاوہ کمرے میں کوئی تیسرا شخص تو موجود نہیں ہے۔ میری رگوں میں دوڑتا خون قدرے سرد پڑ گیا تھا۔ اچانک اُس نے ہنسنا بند کر دیا اور سخت نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا:
''سب مرد یہی بکواس کرتے ہیں۔ مگر اُن کا مطلب یہی ہوتا ہے۔ صرف لفظوں کے پینترے بدل جاتے ہیں۔''
مَیں سمجھ سکتا تھا کہ لوگوں نے اُسے ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ جب چاہا، جس طرح چاہا، اُسے گٹھڑی سمجھ کر کھول لیا اور چٹائی سمجھ کر بچھا لیا۔ جب کہ اُس کی دُکھی آتما کو ہمدردی کی ضرورت تھی۔ مَیں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا مگر اُس نے میرا ہاتھ جھٹک ڈالا۔ مَیں نے ہمت ہارنے کے بجائے پھر سے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔
''ہر روز تمھارا واسطہ کئی لوگوں سے پڑتا ہے.... وشواس کرو مَیں اُن میں سے نہیں ہوں.... بالکل الگ ہوں۔ تمھارا ہمدرد ہوں۔''
''مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں.... تم اپنا کام کرو اور چلتے بنو۔''
اُس نے جھٹکے سے پھر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بستر سے اُٹھ کر ایک کے بعد دوسرا کپڑا اُتار کر قریب رکھی ہوئی کرسی پر پھینکنا شروع کر دیا اور بستر پر دراز ہو کر آنکھیں موند لیں۔ مگر اُس کا جوان بدن بھی مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کر پایا۔ مَیں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ہر قدم پر مجھے شکست دیے جا رہی ہے اور اپنی کسی دُکھتی رگ پر اُنگلی دھرنے کا موقع فراہم نہیں کر رہی۔ گو کہ مجھے خود پر بڑا ناز تھا کہ مَیں عورت ذات کی فطرت سے خوب خوب واقف ہوں۔ میرا اٹل وشواس تھا کہ عورت فطری طور پر ہر جذبے سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ خواہ وہ جذبہ دُکھ ہو، پیار ہو، نفرت ہو یا چاہت ہو۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی برعکس تھا۔
''بُرا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟''
''-----''
''مَیں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں، تم اتنی اُداس کیوں ہو؟ اور تم نے یہ ماتمی لباس کیوں پہن رکھا ہے؟''

وہ جھٹکے کے ساتھ بستر سے اُٹھ بیٹھی اور پھیلی پھیلی نظروں سے مجھ کو تکنے لگی۔ وہ بدستور میرے اندر اُترنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن میری آنکھوں میں تو سچ تھا۔ ایمانداری تھی۔ میرا نرم لہجہ بھی اُس پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدلتے ہی مجھے یقین سا ہو چلا کہ مَیں جلد ہی اُسے رام کر لوں گا۔

''تم کو شاید اپنی اُداسی کا احساس نہیں۔ یقین نہ آئے تو آئینے میں جا کر دیکھ لو..... تمھیں خود پتہ چل جائے گا۔''

''اُس آئینے کی بات مت کرو۔''

''کیوں؟''

''مجھے اُس سے ڈر لگتا ہے.....وہ بار بار یہی کہتا ہے کہ مَیں ویشیا ہوں۔ جسم فروش ہوں۔''

''یہ تمھارا خیال ہے۔ ورنہ ابھی تمھارے چہرے سے ذرا بھی پتہ نہیں چلتا کہ تم سیکس ورکر (SEX WORKER) ہو.....مگر یہی آئینہ تین چار سال میں تم کو پہچاننے سے انکار کر دے گا۔''

وہ سراپا سوالیہ نشان بن کر رہ گئی۔

میرا مطلب ہے اگر تم اِس دلدل سے نہ نکلیں تو دلدل کا کیچڑ تمھارے چہرے پر اُبھر آئے گا.....پھر تم خود کو بھی پہچان نہ پاؤ گی اور یہ کمرہ سدا تمھاری دُنیا بن کر رہ جائے گا۔''

اُس کے ہونٹ مارے خوف کے کپکپا اُٹھے۔ مجھے علم تھا کہ اس قماش کی عورتیں مستقبل کے نام پر خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا اور لب کچھ کہنے کو مسلسل پھڑ پھڑا رہے تھے۔ مگر آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اُسے جب یقین سا ہو چلا کہ وہ کچھ کہہ نہیں پائے گی تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مگر روتے روتے بھی چیخ اُٹھی:

''مَیں اس دلدل سے نکلنا چاہتی ہوں، مگر سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟''

مجھے اُسے ناحق چھیڑنے کا افسوس بھی ہو رہا تھا۔ مگر کچھ کچھ خوشی بھی ہو رہی تھی کہ وہ دلدل میں رہ کر بھی زندہ ہے اور کھلی فضا میں ایک آزاد پنچھی کی طرح پرواز کرنے کو بے قرار ہے۔ مَیں نے اُسے تسلی دے کر چپ کرانا چاہا، لیکن اُس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اپنا دُکھ درد اُگلے جا رہی تھی:

''میں تو یہاں آنے کو بالکل تیار نہ تھی۔ لیکن میرے باپ پر پچیس ہزار روپے کا قرضہ تھا۔ اُسے لوٹانا ضروری تھا.... نہیں تو کھیتی باڑی ہاتھ سے نکل جاتی۔ ماں باپ، چھوٹے بہن بھائی سب بھوکے مرجاتے.... اب قرضہ تھوڑا ہی باقی رہ گیا ہے۔ پھر گانو واپس لوٹ جاؤں گی۔''

''اسی میں تمھاری بھلائی ہے.... ورنہ عمر بھر اس جہنم میں سڑتی رہوگی اور یہیں فنا ہو جاؤ گی۔''

''نہیں نہیں۔'' کہتی ہوئی وہ میرے ساتھ لپٹ گئی اور مجھے اتنے زور سے بھینچا کہ میرے بدن میں برقی لہر دوڑ گئی۔ رگوں میں دوڑتا خون بھڑک اُٹھا اور مَیں اُس کا دُکھ درد، ذاتی ہمدردی کو بھول بھال کر کچھ دیر کے لیے جانور بن گیا اور ہم پوری شدت سے ایک دوسرے کا پہلو گرمانے لگے۔

ایک مختصر سے عرصے کے بعد شاہ جی سے ملاقات ہوئی تو وہ حسبِ عادت مرغولے چھوڑ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُن کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ اُبھر آئی۔

''کیوں راجا! کیا جادو کیا ہے تم نے اُس لڑکی پر؟ جب دیکھو تمھارے بارے میں پوچھا کرتی ہے.... اِس بار تو تمھارا اَتہ پتہ بھی پوچھ رہی تھی؟''

''میرا؟ پھر؟''

''پھر کیا؟...اس کا جواب تو سمے دے گا.... موقع ملے تو اس سے مل لینا۔''

فوراً ہی میرے ذہن کے پردے پر اُس رات کے تمام واقعات ایک فلم کی طرح چل پڑے۔ اُس لڑکی کے مسائل، دُکھ درد، مجبوریاں سب تازہ ہو گئیں۔ سوچ بچار کے بعد مَیں بولا:

''اُس رات آپ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ عورت ذات محض جنس ہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ وہ اپنے لیے کم اور دوسروں کے لیے زیادہ زندہ رہتی ہے۔ وہ واقعی عظیم ہے۔ مرد اُس کے آگے کچھ بھی نہیں۔''

''مگر تم اُلٹی کھوپڑی کے لیکھک بڑوں کی بات کب مانتے ہو؟'' وہ فخر سے بولے۔ ''مَیں نے زندگی کو بہت دور تک دیکھا ہے۔ سر کے بال یوں ہی نہیں گنوائے؟''

مَیں نے جھک کر اپنے بزرگ کے ہاتھ تھام لیے اور احتراماً اپنے ہونٹ اُن پر رکھ دیے۔

مہا نگر میں ''وقت'' ہر آباد بندے کی سوچ، جیب اور قدموں سے لپٹا رہتا ہے۔ اُس سے فرار ممکن نہیں۔ مَیں آزاد صحافی تو تھا ہی۔ ''شمع، بیسویں صدی اور آج کل'' جیسے اردو رسائل میں اپنی کہانیوں کا معاوضہ پا کر خود کو زندہ رکھا کرتا تھا۔ لیکن میری شعوری کوشش یہی تھی کہ کوئی چھوٹی موٹی فلم ہاتھ لگ جائے۔ پھر وقت مجھ پر مہربان ہوا اور مجھے ایک کی بجائے دو فلمیں لکھنے کو مل گئیں۔ ان کاموں میں یوں کھو گیا کہ مجھے صرف فلموں کا ہی خیال رہا۔ ابتدا میں مجھے اُس لڑکی کا خیال ضرور آیا کرتا کہ مَیں جا کر اُس سے ملوں۔ اُسے اس نرک کو چھوڑ دینے پر مزید مجبور کروں۔ مگر جیب کے ساتھ فلمی جدوجہد نے بھی اجازت نہ دی تھی۔ مَیں اُسے قریب قریب بھول چکا تھا۔ مگر ایک شام گھر میں قدم رکھا تو ایک خط دہلیز کے پاس پڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ تحریر انجانی سی تھی۔ لکھنے والی کا نام ستارہ پڑھ کر دماغ چکرا گیا اور حافظے نے بھی کوئی مدد نہ کی۔ اس نام کی کوئی بھی لڑکی میری زندگی میں وارد نہ ہوئی تھی اور نہ ہی مَیں کسی کو جانتا تھا۔ خط پڑھنا شروع کیا۔ تحریر بدخط تھی مگر زبان پختہ تھی۔

''زندگی میں ہماری ایک ہی ملاقات رہی ہے۔ کاش وہ لمحے کبھی ختم نہ ہوتے اور تم میرے دُکھ درد میں شریک ہو کر تسلیاں دیتے رہتے اور زندگی یوں ہی بیت جاتی۔ مگر اب تو تم میری شکل بھی بھول چکے ہو گے۔ مَیں وہی لڑکی ہوں جس سے تم نے اُس کی اُداسی اور اُس کے ماتمی لباس کا سبب جاننا چاہا تھا۔ یقین کرو پوری دُنیا میں تم ہی واحد ہمدرد دکھائی دیے جس کے ہاں مجھے سچ کے ساتھ صداقت بھی دِکھائی دی تھی۔

تمھارا شہر چھوڑنے پر مَیں سیدھی اپنے گانو چلی آئی تھی۔ بہن بھائیوں اور والدین سے مل ملا کر مجھ میں زندگی کے آثار پھر لوٹ آئے تھے۔ مَیں نے تین ماہ نہایت سکون سے گزارے مگر اس دوران جسمانی خواہش دن رات تنگ کرنے لگی۔ حالاں کہ مَیں نے اُس کا گلا دبانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ مگر ردِ عمل برعکس ہوا۔ شدت روز بروز بڑھتی رہی۔ وجہ تم بھی جانتے ہو۔ مَیں تین برسوں تک بلاناغہ کبھی تین، کبھی پانچ، کبھی چھ مردوں کی آغوش گرماتی رہی ہوں۔ اُن کے

بدن کی گرمی میری ہڈیوں تک اُتر چکی ہے۔ وہ صرف مجھ کو تنگ ہی نہیں کرتی، بلکہ اس کارن ایک کے بعد دوسرے مرد کی طلب بھی رہتی ہے۔ اِن حالات میں میرے نزدیک یہی مناسب تھا کہ میں بیاہ کرلوں۔ نکاح کے دوران مَیں نے خود کو دُنیا کی خوش ترین عورت تصور کیا تھا اور مَیں واقعی خوش تھی۔ مگر جلد ہی علم ہوا کہ میرے مقدر میں اور بھی مایوسیاں لکھی ہوئی ہیں۔ میرا شوہر بالکل نارمل آدمی ہے۔ وہ مجھے پیار بھی ٹوٹ کر کرتا ہے۔ مگر اُس سے وصال کے بعد میری پیاس نہیں بجھ پاتی۔ مجھے کسی دوسرے مرد کی شدید طلب رہتی ہے۔ میری حالت اُس تیز ندی کی طرح ہے جو راستہ نہ ملنے پر کنارے توڑ پھوڑ ڈالتی ہے۔ مَیں خود سے خوف کھا رہی ہوں کہ کہیں مَیں مجبور ہو کر ازدواجی راہ سے بھٹک نہ جاؤں۔ تم میرے واحد ہمدرد ہو، اِن حالات میں تم ہی بتاؤ اور مشورہ دو کہ مَیں کیا کروں؟؟

خط میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر پھیل گیا۔
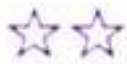
مصنف کے بارے میں

خاندانی نام: جتیندر دیولانیہ

قلمی نام : جتیندر بلّو

تاریخِ پیدائش : ۱۸/نومبر ۱۹۳۷ء

مقامِ پیدائش : پیشاور

تعلیم : بی۔اے (دہلی یونیورسٹی)

سکونت : ۱۹۷۵ء تک بمبئی

۱۹۷۶ء سے تاحال لندن

جتیندر بلّو کی دیگر تصانیف

۱۔ پرائی دھرتی اپنے لوگ (ناول) ۱۹۷۷ء

یوپی اردو اکادمی سے انعام یافتہ

۲۔ پہچان کی نوک پر (افسانوی مجموعہ) ۱۹۸۶ء

۳۔مہانگر (ناول) ۱۹۹۰ء

یوپی اردو اکادمی سے انعام یافتہ

۴۔ جزیرہ (افسانوی مجموعہ) ۱۹۹۴ء

۵۔ نئے دیس میں (افسانوی مجموعہ) ۱۹۹۸ء

۶۔انجانا کھیل (افسانوی مجموعہ) ۲۰۰۱ء

۷۔ وشواس گھات (ناول) ۲۰۰۳ء

۸۔ چکر (افسانوی مجموعہ) ۲۰۰۷ء